نایاب جیلانی

# وہ اک لمحہ

نایاب جیلانی

یہ ایک شکستہ اور بدحال مکان تھا۔
جس کی ٹوٹی دیواروں میں بڑے بڑے گڑھے دکھائی دیتے تھے اور ان کے اندر چوہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ تین مرلے پہ پھیلا یہ مکان انتہائی غلیظ اندھیرے میں ڈوبا گندگی سے اٹا اور بدبو سے بھرا ہوا تھا۔
جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی تھی اس کا جی الٹنے لگا۔
پورا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ انتہائی خستہ حالی کا شکار اور ہر جگہ مرغیوں کا فضلہ، گندگی اور غلاظت بکھری ہوئی تھی۔
یوں لگ رہا تھا جیسے بدبو دماغ میں گھس رہی ہے۔

اور کبھی کبھی دماغ میں گھسنے والی بدبو بھی سوچوں کے در کھول دیتی ہے۔ اور اک اور آگہی کے مرحلوں تک لے آتی ہے اور کبھی کبھی عظیم ٹھوکروں سے بھی بچا دیتی ہے۔ انسان کی زندگی میں کبھی ایک لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ وہ یا تو زندگی سنوار دیتا ہے یا زندگی تباہ کر دیتا ہے۔
اور اس وقت بدبو کو آخری حد تک محسوس کرتی وہ زندگی میں در آنے والے اس لمحے کی قید میں تھی جس نے اسے واپسی کی راہوں تک جانے میں راہنمائی کی تھی۔
کبھی خوشبو تو کبھی بدبو بھی راہنما بن جاتی ہے۔

مکمل ناول

بھی خوشبو تو بھی بدبو بھی بڑے بھلے فیصلے کروا دیتی ہے

کبھی خوشبو تو کبھی بدبو ہم سفر ہوتی ہے۔ اور اس کی ہم سفرنی الوقت بدبو تھی ، جس نے بروقت اس کی آنکھیں کھول کر بہت بڑے گڑھے میں گر جانے اتر جانے ڈوب جانے سے بچالیا تھا۔

اسے اپنے ان الفاظ پہ اب تک پشیمانی تھی جو اس نے اپنے شوہر سے کہے تھے۔

"کل کورٹ میں پہلی اور آخری تاریخ ہو گی۔ اگر دل چاہے تو کورٹ میں آجانا... ورنہ یہاں پہ مجھے تمہاری طرف سے فیصلے کا انتظار رہے گا تحریری فیصلے کا۔"

اور اس وقت انتہائی بدبو دار ماحول میں کھڑی وہ اپنے الفاظ پہ پچھتا رہی تھی۔

اور اسی بساند "گندگی" نے اسے واپس مڑنے اور گلنے سے محفوظ کر لیا تھا۔

اور کبھی کبھی زندگی میں ایک بدبو دار لمحہ بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔

صحن میں زردوبہ سر چکراتی پھر رہی تھی۔

رات بھر باد صرصر کی تند اور صعب ہواؤں نے درختوں کو سخت بے چین رکھا تھا۔ ایسے لگتا تھا آندھی کا غضب شاخوں کو تنوں سے اکھاڑ پھینکے گا۔

بھادوں کے طوفان ایسے ہی دبے پاؤں آتے تھے اور اپنا آپ دکھا کر جاتے۔

صبح دیر تک وسیع و عریض صحن میں پتوں "شاخوں" پھٹے ہوئے پھلوں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کا جگہ جگہ ڈھیر لگ چکا تھا۔ اوپر سے دھول "مٹی" غبار سے اٹی ایک ایک چیز "فرش" فرنیچر "کھڑکیاں" دروازے۔ اب تو یوں لگتا تھا حلق تک میں گرد اور غبار گھس رہا ہے۔ سانس تک لینا محال ہو رہا تھا۔

وہ صبح سے کئی مرتبہ کھانس چکی تھیں اور کئی مرتبہ یہاں کو کوس بھی چکی تھیں جو ہر طوفان " آندھی " بارش کے بعد آرام سے بہانا بنا کر گھر بیٹھ جاتی تھی۔

تاکہ کام زیادہ نہ کرنا پڑے۔ شروع سے بڑی ہڈ حرام تھی۔ اگر آ بھی جاتی تب بھی پھیلاوا زیادہ دیکھ کر آرام سے پائیں برآمدے میں پڑی جھلنگا سی چارپائی پہ ایسی گرتی کہ رات کی خبر لاتی۔ ایسی صورت میں بھی نیلم کو خود سارا گھر سمیٹنا پڑتا تھا۔

اور آج تو نیلم بھی یہاں نہیں تھی۔ آؤٹ پہ آؤٹ آف سٹی تھی۔ جانے کل بھی آتی یا نہیں۔

فرحت کو گندگی دیکھ دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ سارا گھر گرد گرد ہو چکا تھا۔ کچن تک میں جانا محال تھا۔ فرش پہ چلنے سے کرچ کرچ کی آواز آتی تو ان کا دل برا ہوتا۔ اور آج فرائی ڈے تھا یعنی جمعہ "ہاف ڈے"... کچھ ہی دیر میں بھوکی پیاسی جینا "بیلا بھی چلاتی ہوئی آ جاتیں۔ اور انہوں نے کھانے کے نام پر کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اب فوری طور پر کیا پکاتیں؟

ویسے بھی رات سے شدید بلڈ پریشر ہائی تھا۔ اوپر سے وہ عجیب و غریب اطلاع! ان کے دل میں ڈھیر ساری گھٹن بھر رہی تھی اور یہ گھٹن صرف گرد "غلاظت اور گندگی کے سبب نہیں تھی۔ سوچ کچھ اور ہی تھی۔ جس کو سوچنا بھی شدید غصے کے گراف کو بڑھا دیتا تھا۔

اور اس وقت وہ رنگین کھڑکیوں اور قدیم طرز کے ہی رنگین دروازوں سے لٹکے جالوں کو دیکھ کر ہول سی اٹھیں۔ ارے "یہ کہاں سے آگئے؟"

اور صرف کھڑکیوں سے ہی نہیں چھتوں کے کونوں سے بھی جالے لٹکتے نظر آرہے تھے۔ اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ نیلم تو خود بڑی صفائی پسند تھی۔ ایک ایک کونے "کھدرے کا باریکی سے جائزہ لیتی۔ آخری کونے اور سوراخ تک سے کوڑا کرکٹ نکال کر باہر کرتی۔ اس حال میں کہ یہاں خوامخواہ بغلیں جھانکنے لگتی تھی۔ آئیں بائیں کرنے لگتی۔ اور یہ تو یہاں کی ازل سے عادت تھی۔ جھاڑو لگائی اور ادھر ادھر فرنیچر کے نیچے آگے پیچھے کوڑا گھسا دیتی۔

کئی مرتبہ فرحت نے یہاں کی عاجز آکر چھٹی کروا دینی چاہی تھی لیکن ہر مرتبہ نیلم آڑے آجاتی۔ اسے خوامخواہ اس مکار عورت پہ ترس آجاتا تھا۔ کہتی تھی امی! اس کا کون سا گھر بار ہے۔ بے چاری یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی۔"

اور بات تو کسی حد تک نیلم کی ٹھیک ہی تھی۔ رات کو کچی بستی اپنے بھانجوں بھتیجوں سے ملنے چلی جاتی تھی کبھی رات بھی وہیں رہ آتی لیکن زیادہ پڑاؤ اس کا آشیانہ "گلفین" میں ہی تھا۔

اس وقت گندگی "دھول مٹی اور جالوں کو دیکھ دیکھ کر فرحت کا پارہ ہائی ہوتا جا رہا تھا۔ اور صرف یہاں پہ ہی نہیں "نیلم پہ بھی غصہ آرہا تھا۔

"ایک ہفتہ ایک مہینے کے برابر ہو گیا۔ کل چھٹی ہے پھر بھی جانے آئے گی یا نہیں۔ میں تو چولہا چوکی سے تنگ آگئی۔ بھاڑ میں جائے نوکری۔ آتا ہے اس کا باپ تو کرتی ہوں ان سے فائنل بات۔" انہوں نے زیر لب بڑبڑا کر جیسے ہی گھڑی کی طرف دیکھا تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ پیروں میں پہیے سے لگ گئے۔ اسی دھول مٹی کچن میں جاتے ہوئے ایک ایک کیبنٹ کھول کھول کر کچھ تلاش کرتے ہوئے ان کا میٹر پھر سے گھوم گیا تھا۔

"صبح بھی بھوکی پیاسی چلی گئیں۔ اب بھی کچھ نہیں پکا۔ کیا کھائیں گی وہ "کیا میرا بھیجہ؟" انہوں نے عادتاً "ایک ایک دراز کو دھڑ دھڑ بند کرتے ہوئے باآواز بلند کہا تھا۔ یوں کے اندر آتے لدے پھندے سے وکیل صاحب ایک ایک تھیلے کو میز پہ رکھتے گھرے طنزیہ لہجے میں بولے۔

"تمہارا بھیجہ کھا کر کسی نے کند ذہن بیمار نہیں ہونا۔ اللہ تمہارے بھیجے سے سب کو محفوظ رکھے۔"

انہوں نے سبزیوں "پھلوں کے شاپر الگ الگ سلیب پہ رکھے تھے۔ پھر آئس کریم کی بکٹ جلدی سے فریزر میں ڈال دی۔ تاکہ گرمی کی شدت سے پگھل نہ جائے۔ یہ جینا "بیلا کے لیے واحد عیاشی تھی۔ ورنہ تو بے چاریوں کو ایک ایک فرمائش کے لیے دنوں ترسنا پڑتا تھا اور بار بار منتیں کرنا پڑتیں۔ کبھی جو اس گھر میں ان کا من پسند کھانا پکا ہو۔ اور ابھی سبزیوں کے تھیلے دیکھ کر وہ وکیل صاحب کو منہ توڑ جواب دینا بھول گئی تھیں۔

"گوشت کے نام پہ تو یہاں بھیجہ بھی نہیں آتا۔ اسی کو بھون کر ایک وقت کے لیے بچیوں کو بہلا سکوں... ہر روز ٹھنڈے "کدو" کریلے "بینگن" چھپنار۔"

آخر تک پہنچتے ہوئے ان کا دل چاہا تھا ان تمام سبزیوں کو کچا چبا کر الٹ دیں۔ وکیل صاحب سبزی خور تھے "بچیاں سمیت فرحت — گوشت خور۔ مہینے کے شروع میں گوشت آتا تھا۔ باقی کا سارا مہینہ دال اور سبزیوں پہ گزارا کرنا پڑتا۔

یہاں پہ وکیل صاحب بھی بے بس تھے۔ سرکار سے جو پنشن ملتی تھی۔ اسی میں کھینچ تان کے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ اسی محدود پنشن میں بجلی "گیس "پانی" انٹرنیٹ کا بل نکلتا تھا۔ اور جو پیسے بچتے تھے ان میں بمشکل مہینے بھر کی دال "سبزی چلتی تو بڑی غنیمت تھا۔

## سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی مصنفہ صبا سحر کی والدہ طویل علالت کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

بے شک موت برحق ہے اور ہم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ لیکن ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے ہم صبا کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

"تم تو سدا کی ناشکری ہو۔ کبھی جو شکر ادا کیا ہو۔ بٹیروں سے بہتر ہیں۔ کھا کر سوتے ہیں۔ بھوکے نہیں رہتے اور ویسے بھی تمہارا ناشکرا پن آج کا تھوڑی ہے۔ یہ تو ازل سے ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔" وکیل صاحب نے بڑی گہری ضرب لگائی تھی۔ فرحت کا پہلے سے پھٹا بھیجہ الٹ سا گیا۔

"میرے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔ ویسے بھی ساری زندگی تم نے باتوں کی کمائی کھائی ہے۔ جتنی زبان گھر میں چلاتے ہو۔ اتنی عدالت میں چلا لیتے تو ہمارے حالات ایسے کبھی نہ ہوتے۔ یہ تو سرکار کی مہانی تھی جس نے تمہیں جھیل لیا۔ ورنہ پرائیویٹ پریکٹس کرتے تو چولہا چوکی بھی ٹھپ ہو جاتا۔" فرحت نے ٹنڈے "کدو" بیچ بیچ کر ٹوکری میں رکھے تھے۔ ہری مرچیں دھوتے ہوئے وہ خود بھی ہری مرچ ہو رہی تھیں۔

"تم جیسی بھاگوان سے متھا جو لگا ہے۔ ہاتھ آگے جانے کے بجائے ہمیشہ پیچھے ہی رہا۔ مان جاؤ کہ یہ ساری تمہاری بے برکتی ہے۔" وکیل صاحب نے خود آگے بڑھ کر بیگم کے عتاب سے خربوزوں کو بچایا تھا۔ ورنہ پھلوں میں خربوزے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ بل پڑ جاتے تھے۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"یہ پھیکے سیٹھے آلو ملے تھے؟ نہ ذائقہ نہ مٹھاس۔"

"دماغ کے ساتھ ساتھ بینائی بھی چلی گئی؟ حد ہے بیگم! خربوزے تمہیں آلو دکھائی دے رہے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی بھر کے اس میں خربوزے اور آم بھگو دیے تھے۔ آموں کو دیکھ کر فرحت کی تلخی کچھ کم ہوئی تھی۔

"صد شکر کہ تمہیں بھی ڈھنگ کا کوئی فروٹ نظر آیا۔ بچیاں شوق سے کھا تو لیں گی۔"

"سارے چٹخارے تمہارے اپنے ہوتے ہیں۔ بچیوں کا نام رکھ کے اپنا سواد پورا کرتی ہو۔" وکیل صاحب نے بھی وہاں لگا دی تھی جو پانی سے بھی نہ بجھتی۔

فرحت نے گھور کر انہیں دیکھا تھا پھر تلخی سے بولیں۔

"جیسے تم نے تو نعمتوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔"

"گھما پھرا کر بات کو لے آئی ہو نا۔ ناشکری پہ۔" وکیل صاحب نے گہرا طنز کیا تھا۔

فرحت نے سارا دالوں والا تھیلا کھنگال ڈالا تھا۔ لیکن جس کی تلاش تھی وہ ملا ہی نہیں۔ ان کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کیا پکائیں؟ بچیوں کی وین بھی آنے والی تھی۔ مارے بوکھلاہٹ اور غصے کے انہوں نے ایک مرتبہ پھر وکیل صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"وہ موئے شیطان کی آنت سے لے آتے تو تمہارے خزانے میں کوئی کمی نہ آجاتی۔" انہوں نے دالوں کے سارے پیکٹ دراز میں ایک ایک کر کے پٹخ دیے تھے۔ گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو اور بھی غصہ آیا۔ اب کیا پکاؤں؟ بچیاں تو آنے والی تھیں۔ اور کھانے کے نام پر ٹنڈے "کدو" کچنار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اور یہ سب ابھی پکنے کے مرحلے سے محروم ہی تھے۔

"شیطان کی آنت کیا؟" وکیل صاحب باہر جاتے جاتے چونک سے گئے تھے۔

"ارے وہی۔ جو دس منٹ میں پک جاتے ہیں۔ پانی میں ابال کر۔" فرحت کو مارے جھنجلاہٹ میں نام تک بھول گیا تھا۔

"نوڈلز۔" وکیل صاحب نے ان کی یادداشت کو کوستے ہوئے چبا چبا کر کہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ایک ٹنڈا اٹھا کر ان کے سر پہ دے ماریں۔ آنکھوں پہ چربی چڑھ گئی تھی۔ سامنے رکھے پیکٹ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پھر وہ مزید باتوں کے تیر چلاتے چلاتے رک سے گئے تھے۔ گو کہ فرحت اور ان کے درمیان تلخ کلامی معمول کا حصہ تھی۔ جس میں فرحت کا اپنا جوش و خروش بھی دیدنی ہوتا تھا۔ لیکن آج فرحت گولہ باری کے دوران بھی بہت الجھی الجھی لگ رہی تھیں۔ جیسے شدید ٹینشن کا شکار ہوں۔ یا شدید ڈپریشن میں مبتلا ہوں۔



آخر کیا وجہ تھی؟ وہ مزید فائر کھولنے سے پہلے کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پوچھیں یا نہ پوچھیں۔ اور ابھی تک تو فرحت بھاپ سے چلنے والے چھوٹے انجن کی طرح دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ اگر پوچھ لیتے تو پھٹ ہی پڑتیں۔ جانے کیا ہوا تھا؟ اور جانے کس کی شامت آنے والی تھی؟

"آج اسٹیمر سے بھاپ خاص اور قسم کی نکل رہی ہے۔ خیر تو ہے بیگم!" ان کا پوچھنے کا اسٹائل بھی بوکھری ٹائپ کا تھا۔ وہ جو نوڈلز کے لیے پانی ابال رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے گہری سوچوں کے اژدحام سے باہر آئیں اور پھر دوبارہ ڈوب گئیں۔ اب تو وکیل صاحب کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ ان کے باہر نکلتے قدم پلٹ آئے تھے۔ یعنی وہ رزم گاہ کی طرف دوبارہ آئے تھے۔

"کچھ نیا ہوا ہے کیا؟" وہ خاصے متفکر تھے۔ فرحت اچانک خیالوں سے باہر آئی تھیں۔ پھر ان کی تیوری کے بل نمایاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر زہر بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا تھا۔

"نیا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی تک تو پرانا ہی بھگت رہے ہیں۔ اسی میں سرخرو ہو گئے تو بڑی بات ہے۔" ان کا لہجہ بھی آنچ دیتا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟" وکیل صاحب کی آنکھوں میں لہری اٹھی تھی۔ فرحت نے چمچہ زور سے سلیب پہ پٹخا تھا۔ پھر گردن گھما کر شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔

"سب کچھ کر کرا کے، ہمارے حلق میں پھندا ڈلوا کر پوچھتے ہو ہوا کیا ہے؟" فرحت جیسے پھٹ پڑی تھیں۔

اور اب کے وکیل صاحب بھی کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔ تو کیا آج پھر محترمہ کو پرانے قصے یاد آگئے تھے؟ اور جیسے ہی فرحت کو بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی تھیں ایک لمبی لڑائی اور ایک طویل "دور جنگ" ضرور چلتا تھا۔

وکیل صاحب تو جیسے چھیڑ کر پچھتائے تھے۔

"اپنے قصور تو تمہیں بھول چکے ہیں۔" "نہیں بھی بلاوجہ ہی غصہ آگیا تھا۔ ورنہ ہزار مرتبہ سوچتے تھے کہ کم از کم اس موضوع پہ فرحت سے منہ ماری نہیں کریں گے مگر پھر بھی۔

"ہمارے گناہوں کی باری تو بہت بعد میں آتی تھی۔ پہلے تو تم نے ایسا دھکا دے کر کنویں میں گرایا تھا جو آج تک اسی کنویں میں بے بس پڑے ہیں۔ نہ نکل سکتے ہیں نہ کوئی نکالتا ہے۔" فرحت کا لہجہ غیض آلود ہو گیا تھا۔ وکیل صاحب بھی اس الزام پہ فل فارم میں آئے تھے۔

"تم جیسوں کو کون ہاتھ دے کر نکالے؟ جنہیں کھائی میں گرنے کا شوق ہو، وہ ٹھنڈا لگنے سے بھی گر پڑتے ہیں۔"

"جہنم میں تم ہی نے جھونکا تھا۔" وہ اس معاملے میں کبھی بھی ہار نہیں مانتی تھیں۔

"جس جہنم کا واویلا کر رہی ہو تم۔ اس میں چنگاری تم نے سلگا کر خود جہنم بھڑکائی تھی۔ سارا قصور تمہارا تھا۔ تمہاری ہٹ دھرمی، نام نہاد انا اور ضد کی وجہ سے نوبت یہاں تک آئی تھی۔"

وکیل صاحب دھیمی آواز میں تلخی سے بولے تھے۔ وہ چاہ کر بھی فرحت کی طرح اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ فرحت تو انہیں دو کی چار سناتی تھیں، برتنوں پہ غصہ نکالتی تھیں، کچھ اور نہیں تو اپنی بھڑاس یہاں پہ انڈیل کر اس فرسٹریشن کے اثر کو زائل کر لیتیں۔ وہ خود کیا کرتے؟ کسے اپنے اندر کے زخم اور ناسور دکھاتے۔ اپنے اندر کے حبس کو کیسے باہر نکالتے؟ کس سے دکھ کا حال کہتے؟ کس پہ بھڑاس نکالتے؟ کس پہ غصہ کرتے۔

"اور جو تمہارے سگوں نے کیا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا؟ دولت کیا آئی آنکھیں بدل گئے تھے۔" فرحت غصے میں چیخ گئیں۔

"پیسے کی کمی انہیں پہلے بھی نہیں تھی۔" وکیل صاحب نے انہیں یاد دہانی کروائی تھی۔

"ارے جہنم میں جائے ان کا پیسہ۔ میری تو جوتی کو بھی پروا نہیں۔" فرحت اپنے ازلی جلال سے بولی

تھیں۔ وکیل صاحب ان کو تاسف سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"یہی تمہارے تب بھی کرتوت تھے۔ اپنی ناک نیچے نہیں آنے دیتی تھیں۔ حلیمی تم میں تھی نہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تھیں۔"

"اپنے سگوں پر تو تم آنچ نہیں آنے دو گے۔" انہوں نے مارے غصے کے برنر زور سے بند کیا۔ ساس پین اتار کر سلیب پہ پٹخا تھا۔

"میرے سگوں کے ساتھ تم بھی سگی بن جاتیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔" وکیل صاحب نے سابقہ تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"اب بھی ان ہی کی حمایت کرنا۔۔۔ ان ہی کو ٹھیک سمجھنا ساری غلطیاں سارے قصور ہمارے تھے۔"

فرحت نے لہجہ بدل لیا تھا۔ انداز بدل لیا تھا۔ اب ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی بھی بھر بھر آئی۔ بس رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ جیسے ہی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور وکیل صاحب میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ ان ہی آنسوؤں کے حربوں سے ہمیشہ فرحت انہیں رام کرتی آئی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ ساری بھڑاس نکال کر یہ حربہ بعد میں استعمال کرتی تھیں۔

"تم اپنی خوبد لتیں کچھ ذرا سا جھکاؤ لاتیں۔ تھوڑی حلیمی پیدا کرتیں تو آج وقت بہت مختلف ہوتا۔" وکیل صاحب کا لہجہ بھی بہت بوجھل ہو گیا تھا۔

"ارے ہم ہی پیر پکڑتے ناک نیچی کرتے تمہارے "ہوتوں سوتوں" کی منتیں کرتے تب ہی تم ہم سے خوش دکھائی دے سکتے تھے۔" وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھیں پھر سابقہ تنتناہٹ سے بول پڑیں۔

"لیکن میں نے بھی نوشابہ کی ضد کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ بڑی آئی تھی مجھ پہ رعب جمانے والی۔ بات یوں کرتی تھی جیسے میں اس کی زر خرید ملازمہ ہوں۔"

"اس سارے پروسیس میں نقصان کس کا ہوا؟ کبھی تم نے سوچا ہے اس بات کو؟" وکیل صاحب کے اگلے الفاظ نے یک دم فرحت کو خاموش ہونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ گھڑی بھر کے لیے گم صم ہو گئی تھیں۔

جیسے وکیل صاحب کی بات عین نشانے پہ لگی تھی۔ ان کا چہرہ بھی کچھ دیر کے لیے سفید پڑ گیا تھا۔ لیکن یہ کیفیت ساعت بھر کے لیے تھی۔ دوسرے ہی لمحے ان کی ازلی نخوت عود آئی تھی۔

"سارا قصور ہی تمہارا تھا۔ نہ تم غیر مناسب وقت میں غیر مناسب فیصلے کرتے اور نہ ہی ہمیں آج یہ دن دیکھنے پڑتے۔"

"اگر میں تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تھا تو تم ہی بعد میں عقل مندی کے ثبوت دیتیں۔ ہر رائی کو پہاڑ تم نے بنایا تھا۔" وکیل صاحب غصے میں بھڑک اٹھے تھے۔ معاً گیٹ پہ ہارن کی آواز آئی تو وکیل صاحب سمیت فرحت بھی بوکھلا گئی تھیں۔ ساری بحث سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں گھسا دی گئی تھی۔ کیوں کہ بچیوں کے سامنے اس موضوع کو بہت ہی کم چھیڑا جاتا تھا۔ اور اس وقت وکیل صاحب اور فرحت دونوں ہی سابقہ تکرار کو بھلا کر بیرونی گیٹ پہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے فرحاں شاداں سی جینا، بیلا داخل ہو رہی تھیں۔

ان کے خوب صورت صحت مند سہبوں سے رخساروں پہ دھوپ کی تمازت، پسینہ اور کچھ بے زاری ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ کچھ جوش اور بے چینی سے بھی سرخ ہو رہے تھے اور ان کی کانچ سی نیلگوں آنکھوں میں ڈھیر سارا تجسس بھرا ہوا تھا۔ ایک جیسی شکلیں، ایک جیسے چہرے، ایک جتنے قد۔۔۔ یوں لگتا تھا، اللہ نے جڑواں سی یہ جوڑی بنائی ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ جینا اور بیلا میں صرف دس مہینے کا فرق تھا۔ اور یہ فرق اب بالکل غائب ہو چکا تھا۔ کیوں کہ دونوں کی شکلیں، جسامت اور بڑھوتری ایک ساتھ ہو رہی تھی۔ کوئی انجان تو مانتا ہی نہیں تھا کہ یہ دونوں بہنیں جڑواں نہیں ہیں۔ حتی کہ اسکول، کلاس بھی ایک ہی تھی۔ دونوں کی عادتیں بھی ایک سی اور دونوں کے مزاج اللہ کی پناہ۔۔۔ جانے مزاج کس پہ چلا گیا تھا؟ ایسا نخوت بھرا شاہانہ موڈی۔۔۔ ناک تلے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ فرحت اکثر ان کے نخروں پہ عاجز آجاتی تھیں اور پھر سوچنے لگتیں۔ یہ کس پہ چلی گئی ہیں؟ اور تب ذہن



پیچھے، بہت پیچھے کی طرف بلا سبب بہنے لگتا۔

"اسی پہ، بالکل اسی پہ۔۔۔ ویسی اکڑ، ویسا ہی نخرہ ویسی ہی منہ پھٹ۔" اور اس کا تصور ہی فرحت کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ اسے خیالوں میں بھی نہیں آنے دیتی تھیں۔ جیسے ان کی خیالوں خیالوں میں ہی اس کمینے کے ساتھ منہ ماری ہو جائے گی۔

اور اس وقت جینا، بیلا کے بھاری بیگ اٹھا کر اندر لاتے ہوئے وہ سو مرتبہ اسے کوس چکی تھیں، جو اچانک اس دھوپ بھری دوپہر میں یاد آگیا تھا۔ اور بڑے غلط وقت میں یاد آگیا تھا۔

اور ابھی وہ دودھ سوڈے کا جگ بھر کے لاؤنج میں آئی ہی تھیں۔ تبھی جینا، بیلا سارے کمروں میں تانکا جھانکی کر کے اس وقت کچھ کچھ بجھی بجھی تخت پہ دھم سے بیٹھ گئیں۔ اور انہیں بیٹھتے دیکھ کر فرحت نے بے ساختہ ٹوکا تھا۔

"جینا، بیلا! اٹھو، پہلے یونی فارم بدلو۔ جرابیں اتارو، اور اپنے جوتے بیگ سنبھالو۔ دیکھو، پہلے ہی بہت پھیلاوا ہے۔ اوپر سے یہاں بھی نہیں آئی۔"

وہ اپنی جگہ پہ جمی رہی تھیں۔ ہلیں بھی نہیں۔ بلکہ نیلی نیلی آنکھوں میں ڈھیر سارا غصہ سمو کر ایک ساتھ بولیں۔

"ہم نے کچھ نہیں کرنا۔۔۔ کچھ بھی نہیں کرنا۔" دونوں نے تنک کر کہا تھا، اور ایک مرتبہ پھر ایک ایک کونے پہ نگاہ ڈالی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تلاش تھی۔ جو ناکام ہی رہی۔

"کیوں نہیں کرنا۔ یہ سوڈا تو پیو۔ باہر کیسی آگ پڑ رہی ہے۔ ایسی گرمی کہ حد نہیں۔ ساون گئے اور اپنا حبس پیچھے چھوڑ گئے۔" فرحت ان کی خفگی کا پس منظر جانتے ہوئے بھی نظر انداز کر رہی تھیں۔ اور اس محاذ پہ انہیں اکیلے ہی لڑنا تھا۔ وکیل صاحب بچیوں کی عدالت لگنے سے پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔

"نیلی کہاں ہے؟ ابھی تک نہیں آئی؟ اتنا لمبا آفس ورک ختم ہو کے نہیں دے رہا۔ اسے ہمارا بالکل خیال نہیں۔" جینا کی موٹی موٹی آنکھوں میں پانی پھیلنے لگا تھا۔ اور یہی حال بیلا کا بھی تھا۔ جینا نے ابھی رونے کی ٹرائی ماری تھی۔ بیلا کے آنسو بھی چھلک پڑے تھے۔ یوں کہ فرحت گھبرا گئی تھیں۔ اب ان کے آنسو کون سنبھالتا! اگر چھڑ جاتیں تو پھر نیلم ہی انہیں کنٹرول کر سکتی تھی۔ فرحت کے بس کا روگ نہیں تھا۔

"سہ پہر تک پہنچ جائے گی۔" کچھ سوچ کر فرحت نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ گو کہ انہیں کنفرم نہیں تھا کہ نیلم سہ پہر تک پہنچ جائے گی۔ پھر بھی بچیوں کو کسی نہ کسی طرح بہلانا تو تھا۔

"پرامس؟" دونوں نے بے ساختہ چونک کر پوچھا تھا۔ ایک لمحے میں ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور یہ پرامس کوئی عام پرامس نہیں تھا۔ اگر وہ پرامس لے رہی تھیں تو اس کا مطلب تھا ہر صورت نیلم کا سہ پہر میں گھر پہنچنا، ورنہ تو اس گھر میں بھونچال آ سکتا تھا

مرتا کیا نہ کرتا فرحت کو سر ہلانا ہی پڑا تھا اور جیسے ہی انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں بچیاں ہرا کا نعرہ لگاتی غٹا غٹ سوڈے کا گلاس چڑھا گئی تھیں۔ پھر انہوں نے بغیر کسی نخرے کے یونی فارم بھی تبدیل کر لیے تھے۔ بیگ بھی سمیٹے، جوتے بھی اٹھائے۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آگئی تھیں۔

"آج کیا پکا ہے؟" اب اگلا امتحانی مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے ٹنڈے، کدو بینگن کی بھری ٹوکری سلیب پہ دیکھی تھی۔ ایک دم جیسے چیخ ہی پڑیں۔

"ان میں سے کچھ پکا ہو گا، ہمارے کھانے کے لیے یہی رہ گیا ہے۔ بھوکا ماردیں ہمیں۔ صبح بھی دو پاپے کھلا کے بھیج دیا تھا۔ لنچ کے نام پہ کچھ بھی نہیں اور ابھی یہ ٹنڈے، کدو نہیں کھانا ہمیں۔" وہ پاؤں پٹخ کر رونے لگی تھیں اور رونا جیسے انہوں نے پلکوں پہ دھرا ہوتا تھا۔ جب دل کیا بھاں بھاں کرنے لگیں۔ اور ان دونوں

تو کچھ زیادہ ہی رونا مچا رکھا تھا۔ بات بے بات غصہ کرتیں، لڑتیں اور رونے بیٹھ جاتیں۔

فرحت تو اس صورت حال سے تنگ آچکی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا ایک ایک چماٹ لگا کر چپ کروا دیں۔ ان کی اپنی طبیعت اس اطلاع پہ صبح سے سخت بے زار تھی۔ اوپر سے ان بچیوں کے نخرے۔

"بڑے نواب آف دکن کی بیٹیاں ہو۔ جو صبح شام سات سات ہرن بھون کر تمہارے سامنے رکھے جائیں۔" فرحت اب اپنی ساری فرسٹریشن بچیوں پہ نکال رہی تھیں۔ جو اتنی بھی بچیاں نہیں تھیں جو ان کے طعنوں کو سمجھ نہ سکتیں۔ پورے دس سال کی جینا اور اس سے دس ماہ چھوٹی بیلا۔ انتہائی تیز طرار، حاضر جواب، ذہین، منہ پھٹ، ہوشیاری، چالاکی میں اپنے "ہوتوں سوتوں" کو مات کر دینے والی۔ انہی کے جیسی بد دماغ اور ہٹ دھرم اور اس وقت فرحت کے طعنے پہ جینا بلبلا اٹھی تھی۔

"ہرن کی ڈیمانڈ کون کرتا ہے؟ یہاں تو ایک منتھ میں چکن مل جائے تو اسی کو عید سمجھ لیتے ہیں۔ ہرن تو ہم خوابوں میں بھی نہ سوچیں۔"

"اور ہرن کو لائک بھی نہیں کرتے۔۔۔ اور ویجی ٹیبلز کو تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ نیلی آلے تو بتاؤں گی۔ ہمیں ہر روز گھاس کھلائی جاتی تھی۔ اور اوپر سے کہا جاتا تھا کہ کس نواب کی بیٹی ہو۔" یہ بیلا تھی اسٹول پہ چڑھ کر چمچے سے ٹیبل بجاتی، بہت تیز لہجے میں بول رہی تھی۔ فرحت کا پہلے سے الٹا بھیجہ اور بھی الٹنے لگا۔

"کن بلاؤں میں پھنس گئی ہوں میں۔۔۔ وہ آ تو لے ہوش ٹھکانے لگاتی ہوں اس کے بھی۔ مجھ سے نہیں قابو ہوتیں یہ چڑیلیں۔" فرحت نے اٹھ کر ساس پین چولہے پہ رکھا۔ برنر گھما کر آگ جلائی۔ اور اس دوران جینا بولتی رہی۔ ایک چپ کرتی تھی تو دوسری بولتی۔ اور کبھی اکٹھا شروع ہو جاتی تھیں اور تب یوں لگتا جیسے اس خاموش آشیانہ ثقلین میں زلزلہ آگیا ہے۔۔۔ اور وکیل صاحب کہتے تھے۔ ان بچیوں کے دم سے رونق تھی۔ اور کیا یہ رونق تھی؟ دماغ پلپلا کر رکھ دیا تھا۔ خود تو وکیل صاحب قیلولہ فرمانے بھاگ نکلے تھے، پھر دو بجے تک جمعہ ادا کرنے بھی جانا تھا۔ فرحت کو ان رونقوں کے درمیان پھنسا کر خود آزاد ہو چکے تھے۔

"یہ فاؤل ہے۔۔۔ نیلی کو بتاؤں گی۔ کبھی ہمیں بلائیں کہا جاتا ہے اور کبھی چڑیلیں۔" جینا نے انتہائی خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ پھر دونوں اٹھ کر باہر جانے لگیں۔ یہ کھانے سے بائیکاٹ کا اظہار تھا۔

فرحت نے نوڈلز دو رکابیوں میں الٹ کر ان پہ کیچپ ڈالی تھی۔ اور پھر دونوں کو آواز دے کر کر خفگی سے روکا۔

"نواب صاحب کی بیٹیو! واپس آؤ کنیز نے تم دونوں کے طعام کا بندوبست کر رکھا ہے بس باپ کی طرح بے صبری رہنا اور کینگی دکھانا۔" فرحت نے میز پہ رکابیاں پٹختے ہوئے گہرا کاٹ دار طنز کیا تھا۔

وہ بھوک کی وجہ سے ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ نوڈلز دیکھ کر ہرا کا نعرہ لگایا اور جیسے رکابیوں پہ ٹوٹ پڑیں۔ اور ان دونوں کو بے صبری سے نوڈلز کھاتے دیکھ کر جانے کیوں فرحت کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔

کیسے چھوٹی چھوٹی نعمتوں کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ ضد کرنا پڑتی تھی۔ رو کے بات منوانی پڑتی تھی اور کبھی "آشیانہ ثقلین" کی اوپری منزل پہ نعمتوں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ لیکن ان دونوں کے نصیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک مصروف ترین بینک کا منظر تھا۔

اور آج پچھلے دنوں کی نسبت رش بھی بے بہا تھا۔ یوں لگتا تھا سارے شہر کی عوام اسی بینک پہ ٹوٹ پڑی ہے۔ عورتیں، جوان، بزرگ۔۔۔ اور عورتوں کے ساتھ آئے چیختے چلاتے بچے۔ پسینہ، گرمی، ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کے لیے بھگدڑ۔۔۔ کہیں بھی ڈسپلن نام کو نہیں تھا۔

بینک کی عمارت میں لگے اے سی بھی شدید حبس اور گرمی کا توڑ نہیں کر پا رہے تھے۔ پنکھے تک آگ

اٹک رہے تھے۔ اوپر سے کام کا اتنا ڈھیر تھا کہ حد نہیں۔

آج جمعہ کے دن ہی نہیں "کلوزنگ ڈے" بھی تھا۔ سونے پہ سہاگا "کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا۔ اسے آج ہی سارا کام ختم کرنا تھا۔ ہر صورت ' ہر قیمت پہ۔۔۔ کچھ فائل ورک ہو چکا تھا اور کچھ پہ کام ہو رہا تھا۔

اوپر سے اس کا بجتا موبائل۔۔۔ گھنٹی پہ گھنٹی' یوں لگتا تھا کوئی ری ڈائل پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے۔ جب اس نے موبائل اسکرین دیکھنا بھی گوارا نہیں کی تو پھر میسجز کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر منٹ کے بعد میسج آتا۔ ہر سیکنڈ کے بعد بیپ بجتی۔۔۔ یوں ایک گھنٹہ مسلسل موبائل بج بج کے خاموش ہو گیا تھا اور اسے موبائل کو پرس سے نکال کر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں نصیب ہوئی تھی۔

اللہ اللہ کر کے بارہ بجے تک کام ختم ہوا' کلوزنگ شروع ہوئی تو وہ منیجر کو سارا ریکارڈ دے کر اپنا پرس وغیرہ سنبھالتی لونگ روم میں آ گئی تھی۔

یہاں پہ اسٹاف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اور انہوں نے الوداعی لنچ میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کیونکہ آج اس بینک میں اس کا آخری دن تھا۔ پیر سے وہ اپنے شہر کی برانچ میں چارج لینے والی تھی۔ کیوں کہ ایک ہفتے تک اس کی پروموشن ہونے والی تھی۔ پیر کو اس نے اپنی برانچ میں بطور منیجر چارج سنبھالنا تھا۔ وہ اپنی برانچ کی سب سے زیادہ محنتی اور کمٹڈ ورکر تھی۔ اس کی پروموشن کے چانس بھی اس کی محنت ' لگن اور ایمان داری کو دیکھ کر بنے تھے۔

کیوں کہ وہ جان توڑ کر کام کرنے کی عادی تھی۔

پھر محنت تو اسے کرنا ہی تھی۔ اپنے لیے نہ سہی ' اپنوں کے لیے ہی سہی۔

اور اس وقت وہ لنچ پہ اسٹاف سے معذرت کرتی واپس جانے کے لیے پر تول رہی تھی ' جب منیجر صاحبہ نے اسے زبردستی روک لیا۔ بقول منیجر صاحبہ کے انہوں نے محض اس کے لیے الوداعی لنچ پہ اتنا اہتمام کیا ہے۔ سو اس کا ان کے خلوص کو ٹھوکر مار کے اٹھ جانا بدتمیزی کے زمرے میں آتا تھا۔

پھر جب روسٹ کا چھوٹا سا پیس ' تھوڑا سا رشین سلاد اور آدھا گلاس کوک کا بھرتے ہوئے خیال پیچھے گھر کی طرف پرواز کرنے لگا تو ایک ایک نوالہ حلق میں اٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ کیا کھا رہی ہوں گی اس وقت؟" کوک کا چھوٹا سا گھونٹ پی کر اس نے بمشکل نوالہ نگلنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی سبزی؟ جو انہیں پسند نہیں ' کوئی دال جسے دیکھ کر پلیٹ فرش پہ جا گرے۔" وہ ہونٹ کاٹتی عجیب سی اداسی کا شکار ہو گئی تھی۔ سامنے پڑی نعمتیں کاٹنے سی لگیں۔ وہ کیسے یہ سب کھا رہی تھی؟ وہ کس طرح سے کھا رہی تھی ' بھوک اچانک مٹ گئی تھی۔ اور کھانے کی خوشبو تک گراں گزر رہی تھی۔

اس کا ہاتھ بے ساختہ پہلو میں جا گرا تھا۔ اور پلیٹ واپس اپنی جگہ پہ پہنچ گئی۔ منیجر صاحبہ نے اس کی بے دلی فورا" نوٹ کر لی تھی۔ تبھی انہوں نے زبردستی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔

"سفر میں جاتے ہوئے خالی پیٹ نہیں نکلتے۔ صبح سے کام کر رہی ہو۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔ تمہاری کوچ نہیں نکلتی۔" منیجر صاحبہ کے بے حد اصرار پہ اس نے تھوڑا سا کھانا بمشکل کھایا تھا۔ پھر ان کی محبت ' خلوص اور مدد کے لیے بہت سا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہتی بینک کی عمارت سے باہر نکل آئی تھی۔

کیوں کہ آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

بینک کی وین اسے اسٹاپ تک چھوڑ گئی تھی۔ اور یہاں سے دو تین گھنٹوں میں وہ اپنے شہر پہنچ جاتی۔ لیکن جانے سے پہلے اسے کچھ لینا چاہیے تھا؟؟ وہ بے خیالی میں پرس کھنگالنے لگی تھی۔ کچھ بچت کی رقم بالآخر ایک پاؤچ سے مل ہی گئی تھی اور سامنے ہی روڈ کراس کرنے کے بعد "چیز ون ٹاور" تھا۔ اس کا دل جیسے للچا گیا۔

وہ جنیا ' بیلا کے لیے کچھ زیادہ نہیں لیکن ایک ایک فراک تو لے سکتی تھی۔ اور وہ دونوں کس قدر خوش ہو جاتیں۔ دو ہفتے بعد ان کے اسکول میں سمر پارٹی بھی



تھی۔ سو کپڑوں کی ضرورت تھی ساتھ جوتوں کی بھی۔ پرانے سینڈل اب کچھ رف ہو چکے تھے۔ پھر جس اسکول میں وہ دونوں پڑھ رہی تھیں۔ وہاں امراء کے بچوں کی زیادہ تعداد تھی۔ بچے رنگ رنگ کے ہر پارٹی میں لباس پہن کر آتے تھے۔ یوں جنیا ' بیلا بھی اس کا ناک میں دم کر دیتی تھیں۔

وہ ہر فنکشن کے لیے نئے کپڑے بنواتیں۔ چاہے ' رو کر ' چاہے ضد کر کے ' چاہے خاموشی کے ساتھ اور نیلم کو ہر بات ہر دفعہ ماننی پڑتی تھی۔ ورنہ ان کے آنسو۔۔۔ اف جنہیں دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

ان دونوں کے آنسو دیکھنا ' اس کی برداشت سے بہت اوپر کا کام تھا۔

اور اس وقت چیز ون ٹاور میں گھوم پھر کر اسے دو بہت نفیس فراک اور میچنگ کے نفیس سے سینڈل مل گئے تھے۔ یوں وہ دل میں بہت ہی الوہی سا سکون سمیٹ کر اپنے شہر کی طرف جانے والی کوچ میں بیٹھ گئی تھی۔

اب دل میں کوئی خلش نہیں تھی۔

اس نے امی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ جنیا ' بیلا کو اچانک جا کر سرپرائز دینا چاہتی تھی اور اس وقت کوچ انسانی جانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ' جب ایک مرتبہ پھر اس کو موبائل چنگھاڑنا شروع ہو گیا تھا اور نیلم ابھی پرس کھول کر موبائل نکالنا چاہتی ہی تھی ' جب کوچ نے زوردار جھٹکا کھایا تھا اور ایک آنٹی اس کے اوپر آ گریں۔ نیلم اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا سر بری طرح سے کھڑکی کے کنڈے سے ٹکرایا تھا اور نیلم کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

آنٹی بھی اس دوران اپنے بھاری جثے کو سنبھال چکی تھیں۔ نیلم کے سرخ چہرے پہ تکلیف کے آثار دیکھ کر بڑے بڑے دانت نکال کر مسکرانے لگیں۔

"کوئی گل نئیں پتر! شیراں نوں لگدیاں رہندیاں۔" آنٹی نے بڑے عام لہجے میں اپنے تئیں معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔ جبکہ نیلم کو ان کی بات بڑی اندر تک چبھی تھی۔ سر پہ لگنے والی چوٹ کا درد اچانک گم گیا تھا اور یہ بات تو اس کے ابو بھی عموماً کہا کرتے تھے۔

"چوٹ اسی کو لگتی ہے جو بہادر ہو اور چوٹ سہنے کی ہمت رکھتا ہو۔" ابو کی آواز اسے اذیت کی گہرائی میں لے گئی تھی۔ وہ کبھی بھی ابو کو بتا نہیں سکی تھی کہ نہ وہ بہادر ہے نہ اس میں چوٹ سہنے کی طاقت ہے۔ اس پہ جو بھی گزرا تھا۔ اس کی ہمت اور طاقت سے بڑھ کر گزرا تھا۔

بہت بری بازگشت میں کھو کر وہ ایک مرتبہ پھر بجتے موبائل کو نظر انداز کر چکی تھی۔ ایک تو گھٹن ' گرم لو ' اوپر سے انسانوں کا ہجوم۔۔۔ پسینے کی بدبو اور باتوں کا عجیب بے ہنگم شور۔۔۔ اس کا زپ کی طرف بڑھتا ہاتھ اچانک رک گیا تھا۔

شاید گھر سے کال ہو یا پھر۔۔۔

"خیر جو بھی ہو کوچ سے اتر کر دیکھوں گی۔" اس نے پرس کو بند ہی رہنے دیا تھا۔ پھر مٹھی میں پکڑا کرایہ کنڈیکٹر کو تھما کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

گو کہ شدید لو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ پھر بھی وہ گردن باہر نکال کر اس گھٹن زدہ ماحول کی کثافت کم کرنا چاہ رہی تھی۔ معاً" اس کے شہر کی حدود شروع ہونے لگی تھیں۔

اس گھٹن ' گرمی اور حبس میں یوں لگا تھا کہ باد صبا کا جھونکا منہ سے ٹکرا گیا ہے۔ اس کے انگ انگ میں خوشی اور سرشاری بھر گئی تھی۔

جنیا اور بیلا سے ملنے کی خوشی میں اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی دن لگ گئے تھے۔ حالانکہ وہ اکثر ٹریننگ کے لیے بھی شہر سے باہر جاتی رہتی تھی۔ لیکن تب جنیا ' بیلا اتنی بڑی نہیں تھیں۔ امی کے بہلانے سے بہل جاتی تھیں۔ لیکن اب صورت حال کچھ مختلف تھی۔ رات کو بھی امی کی کال آئی تھی۔ اور وہ ان دونوں سے ناک تک عاجز آئی لگتی تھیں۔

باقی ساری چیزیں تو ایک طرف ان دونوں کو کھانا کھلانا کے تو سر کرنے کے برابر تھا۔ اور اگر کھانا من

پسند ہوتا تو؟ پھر کیا ہی کہنے ہوتے۔ وہ دونوں شاہانہ مینیو پسند کرتی تھیں۔ ہائی فائی ٹائپ کا۔ جو کہ نیلم کی اوقات اور وسائل سے بہت بڑھ کے ہوتا۔

اس کی بڑی اچھی سیلری تھی۔ پروموشن کے بعد بیس ہزار کے قریب۔۔ لیکن جینا بیلا کا اسکول بھی شہر کا نامور اسکول تھا۔ جس کی فیس 'فنکشنز' وین کا کرایہ اور بچیوں کو مین ٹین رکھنے میں ساری تنخواہ ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے آج تک گھر پہ ایک روپیہ نہیں لگایا تھا۔ صرف بچیوں پہ لگتا ۴ نہی پہ خرچ ہوتا۔ بچیاں پھر بھی ناخوش تھیں۔ کیونکہ ان کی ڈیمانڈ صرف اچھا اسکول نہیں تھا۔ اچھا پہناوا بھی تھا۔ سب سے زیادہ اچھا کھانا۔

اور کھانے کا مسئلہ اس گھر میں مسئلہ کشمیر بنتا جارہا تھا۔

ابو کی محدود پنشن میں گھر چلانا امی کے لیے بھی بہت مشکل تھا۔ اوپر سے جینا' بیلا کی فرمائشیں جو دن بدن بڑھتی جارہی تھیں۔

اور اس وقت کوچ سے اتر کر وہ جینا بیلا کو سمجھانے کے بارے میں الفاظ سوچ رہی تھی' جب اپنے ہی اسٹاپ کی ایک تکہ شاپ سے اس نے تکہ اور ونگز' فرائز' پیک کروالیے تھے۔ ساتھ کوک کے ٹن بھی اور جیسے ہی وہ اپنی پرانی کالونی میں داخل ہوئی موبائل نے پھر سے چیخنا شروع کردیا تھا۔

اب کی بار نیلم نے جلدی سے پرس کھول کر موبائل نکالا تھا اور جھٹ سے آن کرکے کان سے لگا لیا۔ موبائل آن کرنے سے پہلے اس نے اسکرین چیک کی تھی اکتالیس مسڈ کالز اور اکیاون مسیجز کو دیکھ کر اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"اب بھی کال پک نہ کرتیں کیا ضرورت تھی۔ یہ تو میں ہوں۔ تمہارے پیچھے پاگل۔ سہما ہوا۔ تمہیں تو پروا بھی نہیں ہے۔۔ پچھلے ایک ہفتے سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ شہر سے باہر گئی تھیں تم۔ دنیا سے نہیں' یہ نہیں پتا کوئی کس قدر پریشان ہوگا۔ کیسے کیسے وہموں میں پڑا ہوگا۔ میری تو جان پہ بنی ہوئی تھی۔ جانے تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ تم بیمار نہ ہو چکی ہو۔ یا پھر خدانخواستہ کچھ اور۔۔۔ اور تمہیں ایک میسج پہ اپنی خیریت بتادینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔"

خرم جو بولا تو نان اسٹاپ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ اور وہ ٹھیک ہی نیلم پہ ابال نکال رہا تھا۔ واقعی ہی وہ خرم سے رابطہ نہیں کر سکی تھی' بلکہ وہ تو گھر میں بھی بہت کم بات کر سکی تھی۔ امی سے ایک آدھی مرتبہ بات ہوئی تھی۔ جینا' بیلا سے تو وہ بھی نہیں۔

اور ابھی اسے گہرا سانس کھینچ کر خرم کو وضاحت دینا تھی۔ اسے منانا بھی تھا اور اس کا غصہ بھی کم کرنا تھا۔ گو کہ بینک میں اتنا کام کرنے کے بعد' پھر اتنی شدید گرمی میں سفر کرکے دماغ پلپلا رہا تھا۔ طبیعت بے زار تھی۔ اور تھکن سے انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس ساری تکلیف اور تھکان کو ایک طرف رکھ کے اسے خرم سے فریش اور تروتازہ لہجے میں بات کرنا تھی۔

یوں اس نے گلا کھنکھار کے اپنے آپ کو بمشکل ہی تازہ کیا تھا۔ پھر قدرے نرم آواز میں بولی۔

"خرم! میری بات سنو۔۔۔ میں تو۔"

خرم نے اچانک اس کی بات اچک کر کاٹ دی تھی۔

"کوئی ایکسکیوز نہیں۔ کوئی وضاحت نہیں' کیا تمہیں ایک میسج ٹائپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا؟"

وہ غصے سے چبا چبا کر بولا تھا۔

نیلم فٹ پاتھ پہ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لیے رک گئی۔ یہ شہتوت کا سایہ دار درخت تھا۔ نقوی انکل کے گھر کی بیرونی دیوار سے لگا ہوا۔ گیٹ کے برابر کیبن کے پاس ان کی پوتی سوہا کی سائیکل کھڑی تھی۔ جسے دیکھ کر نیلم کو جینا بیلا کی فرمائش یاد آگئی تھی۔ اس سالگرہ پہ ان دونوں نے بے انتہا شور مچایا تھا کہ دو نہ سہی' نیلم ایک ہی سائیکل لے دے۔ وہ دونوں باری باری چلا لیا کریں گی۔ مگر نیلم کا وہی رونا۔۔۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ نکل آتا کہ ساری بچت ہوا ہو جاتی تھی۔

اس وقت شہتوت کے درخت تلے کھڑے ہو کر نقوی انکل کے پرانے طرز پہ بنے بنگلے کو دیکھتے ہی اسے کچھ خیال آیا تھا۔ یہ ایک عجیب سا خیال تھا۔ چونکا دینے والا۔

وہ تھوڑا اچک کر باؤنڈری وال سے دیکھنے لگی۔ ڈرائیو وے پہ چم چم کرتی ہنڈا سوک کھڑی تھی۔ بالکل نئی' کیا نقوی انکل نے نئی گاڑی لے لی تھی؟

اس کی بے سمت نکلتی سوچوں کو بریک تب لگے تھے جب اس کی طویل خاموشی پہ خرم چلا اٹھا تھا۔ تب نیلم حواسوں میں آکر ایک مرتبہ پھر منمنائی تھی۔

"یقین کرو' ٹائم ہی نہیں۔" اس کی منمناہٹ کو خرم نے لمحہ بھر میں ریزہ ریزہ کردیا تھا۔

"میرے سامنے مصروفیت کا رونا مت رو کر دکھانا۔" خرم نے اسے دھمکایا تھا۔ "کیا تمہیں دو لفظ ٹائپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا؟" خرم کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شہتوت کے نیچے ایک چبوترے پہ بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔ اسٹاپ سے یہاں تک آنے میں ہی اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔

"خرم! پلیز' میری بات تو سن لو۔ اتنا کام کا برڈن تھا۔ کلوزنگ چل رہی تھی۔ نہ میں کال پک کر سکی نہ خود کرنے کا وقت ملا اور اس ایک ہفتے کے دوران میری جینا بیلا سے بھی بات نہیں ہو سکی۔" ابھی وہ خرم کو مزید وضاحت دے کر ٹھنڈا کرنا چاہتی ہی تھی جب اچانک خرم نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا تھا یوں کہ لمحہ بھر کے لیے نیلم "سن" سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"میں جینا' بیلا نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ بہت کھردرا تھا۔ بے انتہا کھردرا گو کہ الفاظ اتنے برے نہیں تھے پھر بھی نیلم کو بہت ہی برے لگے تھے۔ اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ جتائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"تم جینا بیلا ہو بھی کیسے سکتے ہو؟" نیلم کا روکھا انداز ملاحظہ کرکے خرم کو شدت کے ساتھ اپنے الفاظ کی تلخی کا احساس ہو گیا تھا۔ معاً اس کا انداز معذرت خواہانہ ہو گیا۔

"آئم سوری تمہاری لاپروائی نے مجھے اتنا روڈ کر دیا۔ تم سے دوری نے میری یہ حالت بنادی۔ قائم مقام فیجر سے دو مرتبہ ڈانٹ کھائی آج۔ بس یہی دعا کر رہا تھا تم جلدی سے آکر چارج سنبھال لو۔ میری بھی بخشی تم ہو۔" خرم واپس پرانی جون میں لوٹ آیا تھا۔ اس کا غصہ بھی پہلے سے کم ہوا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"جہنم میں۔" نیلم نے ترشی سے کہا تھا۔ خرم کے لہجے میں لجاجت بھر گئی تھی۔ اب وہ نیلم کی خفگی کم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ "جینا بیلا" ایسا موضوع تھا جس پہ وہ اپنی ماں کی بھی نہیں سنتی تھی۔ پھر خرم کی کیسے سن سکتی؟

"غصہ جانے دو نیلم! تم میری پریشانی کو جانتیں نہیں نا۔۔۔ اسی لیے میری جان پہ بنی ہوئی تھی۔ دو مرتبہ تمہارے گھر جانے کا بھی سوچا تھا۔ لیکن پھر مناسب نہیں لگا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو خود اڑ کر تمہارے پاس آجاتا۔" خرم نے اس انداز میں منت کی کہ نیلم کو مانتے ہی بنی تھی۔ ویسے بھی خرم کو بڑی جلدی منانا آتا تھا۔ اور یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ نیلم روٹھتی وہ منا لیتا۔ روٹھنا' خفا ہونا' جلدی غصہ کر جانا نیلم کی فطرت کا حصہ تھا۔ اور یہ عادت آج کی نہیں تھی۔ بچپن کی تھی۔ اور اگر خرم اسے منایا نہ کرتا تو ایک بات طے تھی۔ نیلم کو خود سے پیچھے لپک لپک کر آواز دینے کی عادت نہیں تھی۔ شاید یہ عادت اس نے امی سے چرائی تھی۔ ہاں' جس جگہ اس کی غلطی ہوتی۔ وہ ایکسکیوز بھی کر لیتی تھی۔ کوئی مانتا یا نہ مانتا یہ مقابل پہ منحصر تھا۔

"اٹس اوکے خرم!" نیلم بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ اور خرم اسی بات پہ خوش ہو گیا تھا۔

"تھینک یو۔۔۔" وہ بے طرح کھلکھلا کر بولا۔ "اب بتاؤ ملو گی کب؟" خرم آئندہ کا پروگرام جاننا چاہتا تھا۔

"بینک میں۔" نیلم نے کچھ سوچ کر بتایا تھا۔ خرم جیسے چیخ پڑا۔

"ہرگز نہیں۔"

"توپھر۔" وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاپر اور پرس احتیاط سے دوسرے ہاتھ میں کیا تھا۔

"بینک پیر کو کھلے گا۔ اور میں تب تک انتظار نہیں کر سکتا۔" خرم نے جتلایا۔۔ نیلم کچھ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ معاً" نقوی انکل کے بنگلے کا گیٹ کھلا تھا۔ نیلم جلدی سے شہتوت کے تنے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ وہی ہنڈا سوک بیک ہوئی پھر روڈ پہ سیدھی ہو گئی تھی۔ فرنٹ سیٹ پہ وقاص تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ کون تھا، نیلم کو یوں لگا جیسے وہ پتھر ہو گئی ہے۔ سن ہو گئی ہے۔ کسی مجسمے میں ڈھل گئی ہے۔

اور اگر وہ وہی تھا جسے نیلم کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ پہچان رہی تھیں تو پھر یہ کیسا بھیانک انکشاف تھا۔ جو کھڑے کھڑے اس کی ذات پہ اترا تھا۔ اور اسے لمحوں میں کیا سے کیا بنا گیا تھا؟

وہ لمحوں میں کسی بے جان بت کی طرح اپنی جگہ پہ جم گئی تھی۔ وہ جیسے کسی مورت میں ڈھل گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پہ سہا بیٹھی تھی اور وہ لٹک کر آگے کی طرف ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے بندے کی طرف جھول رہی تھی۔ یہ لاڈ کا ایک معصومانہ انداز تھا۔ وہ اس کا گال چومتی کھلکھلائی تھی۔ پھر گاڑی زن سے نیلم کے سامنے سے گزر کر دور ہوتی چلی گئی تھی۔ یوں کہ بالکل نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

اور نیلم بے جان سی کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کھڑے ہونے پہ بھی حیرانی تھی۔ اسے اپنے چلنے پہ بھی حیرانی تھی۔ اسے اپنے زندہ ہونے پہ بھی حیرانی تھی؟ کیا وہ اتنے بڑے انکشاف کے بعد بھی چل رہی تھی؟ اور کیا وہ اسے دوبارہ زندہ سلامت دیکھ کر بھی چل رہی تھی؟ نیلم کا دل جیسے تپتی سہ پہر میں جل گیا تھا۔ اور یہ لمبی سڑک پل صراط بن گئی تھی۔ جس کے آخری کونے پہ "آشیانہ ثقلین" تھا اور وہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔ اور اس کے پیر بھی چل کے نہیں دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا پیروں میں چکی کے بھاری پاٹ بندھ گئے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا محال تھا۔

اور اس کے ہاتھ پہلو میں لٹک گئے تھے۔ موبائل سے آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ اور اس کے دل سے بھی آواز آنا بند ہو چکی تھی، پھر اسے اچانک ہی چلتے چلتے ٹھوکر لگی تھی۔ اور بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ تب بمشکل سنبھلتے ہوئے اسے جھٹکا سا لگا تھا۔ پھر جیسے وہ حواسوں میں آ گئی تھی۔ وہ کمینہ یہاں کیسے؟ کہاں سے؟ کیونکر؟ وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ وہ واپس بھلا کیسے آ سکتا ہے؟" کیا یہ نیلم کا الوژن تھا؟ کیا اتنا برا الوژن تھا۔ سورج کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔

دھوپ بھی تیزی سے سمٹی ہوئی دیواروں کے ساتھ چپک رہی تھی۔ صحن کا فرش ابھی تک جوں کا توں تھا۔ ویسا ہی گرد سے اٹا، دھول مٹی ہوا۔ غبار آلود، پتوں، ٹوٹی ٹہنیوں، شاخوں اور گلے سڑے پھلوں کے ڈھیر بھی ویسے کے ویسے جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔

اور آج ہی ایک بجے تقریباً" دو مزدور ٹائپ لڑکے اور دو نوکرانیاں جو نقوی صاحب کے گھر کام کرتی تھیں۔ آشیانہ ثقلین میں بے دھڑک آئے تھے۔ اور بیرونی بل کھاتی چم چم کرتی ٹائلوں والی سیڑھیوں سے اوپر والے جدید طرز پہ بنے پورشن میں گھس گئے۔

پھر تین چار گھنٹے اوپر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ بھاری فرنیچر کے گھسیٹنے، فرش دھونے کی شڑاپ شڑاپ بھی کانوں کو سخت بری لگ رہی تھی۔

پھر کافی دیر بعد اوپر والے پورشن کی ایک ایک چیز کو لشکا کر بیرونی ماربل کی سیڑھیوں کو دھو دھا کر وہ چاروں ہاتھ جھاڑتے نکل گئے تھے۔

اور تب سے ہی فرحت کے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے۔ پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ وہ تکونی لاؤنج میں چکر لگا لگا کر تھک گئیں تو صحن میں آ کر تخت پہ ڈھے گئی تھیں۔ دھونکنی کی مانند چلتی سانسوں سے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اوپر والے پورشن کی خوب صورت بالکونیاں مغرور سی آنکھوں میں استہزاء بھرے انہیں دیکھتی شان سے کھڑی دکھائی دی تھیں۔ اس حالت میں کہ سارے دروازے، کھڑکیاں ہوا کی غرض سے کھلے ہوئے تھے۔ اور جس کا مطلب تھا؟ وہ لوگ آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی فرحت کے





اندر کوئی لوٹنیاں لگانے لگا تھا۔ دل میں بے چینیاں سی بھر گئی تھیں۔

"کیا پتا، میرا انداز غلط ہو" اور مہرین کی اطلاع بھی، یہ صفائی تو ہر چھ مہینے بعد کروائی جاتی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے بھی سارا نیا پینٹ کروایا گیا تھا۔ فرنیچر، پردے تک بدل دیے تھے۔ ہاں جی، ساری بات ہی ٹکوں کی ہے۔ جس کے پاس چند ٹکے، اس کی عزت اس کا سب کچھ۔" فرحت نے آنکھوں میں ڈھیر سارا تنفر بھر کے اوپر والے پورشن کی طرف دیکھا تھا، پھر ایک اور وہم میں مبتلا ہو گئیں۔

"ابھی وہ آفتیں اٹھیں گی تو سوالوں کا لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ اوپر والا گھر کس کا ہے؟ اس کے تالے کس نے کھولے ہیں؟ وہاں کون آئے گا؟ ہم اوپر جا سکتے ہیں؟ کتنا پیارا پورشن ہے ڈراموں جیسا ہم اوپر جائیں گے اندر سے دیکھیں گے۔" فرحت کا سوچ سوچ کر دماغ پلپلانے لگا تھا۔

نگاہ اوپر سے پھسلتی ہوئی نیچے کی طرف آئی تو یوں ہی لگا کسی محل سرا کو دیکھتے دیکھتے اچانک کھنڈرات پہ نظر پڑ گئی ہو۔ گو کہ نچلی منزل بھی بہت اچھی مضبوط بنی ہوئی تھی۔ لیکن عدم توجہی کے باعث، اس کی حالت اوپر کی نسبت کافی شکستہ تھی۔ جگہ جگہ سے پینٹ اکھڑ رہا تھا۔ دروازوں، کھڑکیوں، روشن دانوں کا روغن اتر چکا تھا۔ ہر برسات کے بعد وہ سوچتی تھیں کہ اس دفعہ بچت کے بعد پینٹ ضرور کروائیں گی۔

لیکن ہوتا کیا؟ ہر دفعہ بچت کی رقم ہوا میں اڑ جاتی تھی۔ کبھی پانی کا بل زیادہ آ جاتا تو کبھی بجلی کا اور سارے ترقیاتی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔

اوپر سے جنا بیلا کی دہائیاں۔

"ہمارا گھر سہا جیسا کیوں نہیں؟ ہماری ساری فرینڈز کے گھر اتنے پیارے ہیں۔ بس ایک ہمارا گھر گندا ہے۔ اتنی انسلٹ ہوتی ہے اپنی فرینڈز کو لاتے ہوئے۔"

ان کے چلانے پہ فرحت ڈپٹ کر ان کا منہ بند کروا دیتی تھیں۔

"وہ یہاں ملنے کے لیے آئیں گی یا رہنے کے لیے۔ حد ہے، اتنی اتنی سی بچیوں کو لمبی لمبی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اپنی عمر کے حساب سے باتیں کرنی چاہیے۔"

تب جنا بیلا کا منہ تو بند کروا دیتی تھیں، لیکن اپنی لا محدود سوچوں کا کیا کرتیں؟ کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھیں۔ یہ گھر آہستہ آہستہ کھنڈر بنتا جا رہا تھا۔ آخری مرتبہ بھلا کب روغن کروایا گیا تھا؟ شاید تیمور کی شادی پہ ثقلین نے ہی آناً" فاناً" مزدور لگوا کر دونوں حصے پینٹ کروا دیے تھے اور اس کے بعد نچلی منزل پہ نظر کرم ڈالنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اوپر باقاعدگی سے پینٹ وغیرہ ہوتا تھا اور جیسے ہی بہت سی پچھلی باتوں کی طرف دھیان گیا تھا ان کے سینے میں آگ سی جلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آ گئیں۔

وکیل صاحب جمعہ پڑھنے کے بعد سے اب تک سو رہے تھے۔ فرحت کی ساری دوپہر لحظہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں لگی تھی اور یہ کیسے اطمینان سے خراٹے لے رہے تھے۔

انہوں نے سلگتے ہوئے وکیل صاحب کو جھنجوڑ کر اٹھایا تھا اور وہ بھی جیسے بیگم کے جھنجوڑنے کے ہی انتظار میں تھے۔ لحظہ بھر میں ہی اٹھ گئے تھے۔ پھر اپنی عینک اٹھا کر ناک کی پھننگ پہ رکھتے ہوئے سہمے انداز میں بولے۔

"کیا زلزلہ آگیا ہے؟"

"آیا تو نہیں، بس آیا ہی چاہتا ہے۔" فرحت کا انداز کاٹ دار تھا۔ وکیل صاحب جمائی روکتے ہوئے سیدھے ہوئے۔

"تمہیں پہلے سے الہام ہو گیا؟"

"کبھی کسی بات پہ غور کیا ہو تو پتا چلے۔" وہ کڑھ کر رہ گئی تھیں۔

"تم جو غور کرنے کے لیے موجود ہو۔" انہوں نے بھی طنزیہ انداز اپنایا تھا۔ فرحت شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھورتی رہ گئی تھیں۔

"ویسے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔" وہ پلنگ کے نیچے سے سلیپر ڈھونڈتے ذرا دیر کے لیے رکے تھے۔
"ساری زندگی تم نے غور و فکر کر کے کون سا تیر مار لیا ہے؟" ان کا انداز اس قدر سنجیدہ کہ لمحہ بھر کے لیے وہ چپ ہو گئی تھیں پھر ترخ کر بولیں۔
"تم نے بھی ساری زندگی صرف باتیں بنائی ہیں۔"
"چلو، کچھ تو کیا ہے نا... باتیں ہی سہی۔ اور تم تو اچھی بات بھی نہیں کر سکتیں۔ جب کی دل جلانے والی بات ہی کی۔ تمہاری زبان کے شر سے کبھی کوئی محفوظ نہیں رہا۔" وکیل صاحب بھی میٹھے طنز کی مار مارتے اٹھ کر واش روم میں چلے گئے تھے۔ جب واپس آئے تب بھی فرحت کو سوچوں میں گم ہی پایا تھا۔ جانے کیا مسئلہ تھا؟ صبح سے ہی مراقبے کے یہ دورے وقفے وقفے سے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔ پھر گلا کھنکھار کر مخاطب ہوئے تھے۔
"تم چائے ہی لے آتیں۔ ساتھ پکوڑے بنا لیتیں۔ جینا، بیلا خوش ہو جاتیں۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے ہی اپنی فرمائش بیگم تک پہنچائی تھی۔ چائے کی تو طلب بھی ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت وہ لازمی چائے کا کپ لیتے تھے۔
"اپنے چسکوں میں جینا بیلا کا نام مت رکھا کرو۔" فرحت نے بھی صبح والا طنز واپس انہیں لوٹا دیا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھسیا گئے تھے۔
"کوئی بھی پوائنٹ مس نہیں کرتیں تم۔" انہوں نے اپنی کھسیاہٹ دور کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم ہی سے سارے داؤ سیکھے ہیں۔" فرحت نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔
"جیسے تم تو بڑی بھولی تھیں۔" وہ بھی کھرا جواب دیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ بحث اچانک کسی اور سمت نکل رہی تھی۔ اور فرحت پہ جھنجلاہٹ سوار تھی۔ وہ کس کام کے لیے آئی تھیں۔ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ دوپہر میں بھی جب بات کرنا چاہی تو جینا بیلا اسکول سے آ گئی تھیں۔ پھر وکیل صاحب بھی سونے چلے گئے تھے اور اب ایک مرتبہ پھر لاحاصل تکرار شروع ہو گئی تھی۔ اس شخص کو تو کوئی خیال نہیں تھا کہ ارد گرد کیا ہو رہا تھا؟
معاً" فرحت کو خیال گزرا تھا۔ "کیا انہیں نقوی صاحب نے بھی نہیں بتایا؟" اور جیسے ہی یہ خیال ذہن میں آیا ان کی زبان میں کھجلی سی ہونے لگی تھی۔ انہوں نے بڑے محتاط لہجے میں پوچھا۔
"صبح نقوی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی!؟"
فرحت کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔ ریک سے پرانے اخبار چھانٹ کر نکالتے ہوئے وہ کچھ چونک گئے تھے۔
"واک پہ جاتے ہوئے ہوئی تو تھی۔" پھر وہ دوبارہ سے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ اتنی ردی اکٹھی ہو رہی تھی اور اس عورت کو ذرا بھی دھیان نہیں تھا۔ نیلم نہ ہو تو اس گھر کو کباڑ خانہ بننے میں لمحہ بھی نہ لگے۔
"اچھا..." فرحت چونک گئی تھیں۔ پھر ان کے لہجے میں تجسس سا بھر گیا تھا۔
"نقوی صاحب نے کوئی بات تو نہیں بتائی؟"
"کیسی بات!" وہ اپنے ہی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ فرحت کی بے سروپا باتوں کی طرف دھیان کم ہی تھا۔
"کوئی بھی۔" فرحت نے چڑ کر کہا تھا۔
"وہ تو بڑا باتونی ہے۔ ہزار باتیں آدھے گھنٹے کی واک میں سنا دیتا ہے۔ تم کون سی پوچھنا چاہتی ہو۔" انہوں نے ردی کا سارا ڈھیر الگ کر لیا تھا۔ کچھ کام کے رسائل چھانٹ کر لیے تھے۔
"اچھا تو تمہیں کچھ پتا نہیں... اسی انجان پن میں تو مارے جاتے ہو۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور تمہیں کچھ پتا نہیں۔
اوپر پھر سے بھونچال آ رہا ہے۔ تمہیں خبر نہیں۔"
فرحت نے لمحہ بھر میں ہی وکیل صاحب کو بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ وہ تھوڑے چونک گئے تھے۔ پھر سابقہ انداز میں طنزیہ بولے۔
"بھونچال پہلے نیچے آتے تھے زمین پر اب اوپر بھی آنے لگے آسمان پہ؟" فرحت نے کھا جانے والی

نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر جیسے کرخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

"اس بے نیازی کے خول سے نکل آئو۔ اور کچھ ادھر ادھر کی خبر بھی لو۔" ان کا انداز سخت برہم تھا۔

"مجھے کن سوئیاں لینے کی عادت نہیں۔" وہ چڑ کر رہ گئے تھے۔

"اور تم میرا بھیجہ نہ الٹائو۔ اٹھ کے چائے بنائو اور ساتھ کچھ آلو ہی تل لو۔ نیلم بھی بس آیا ہی چاہتی ہے۔" وکیل صاحب ردی کا ڈھیر اٹھا کر اٹھنے ہی لگے تھے جب فرحت نے سرعت سے ان کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"اوپر شاہی محل میں راج ہنس واپس آرہا ہے بلکہ آ چکا ہے۔ آج نہ آئے تو کل تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ تمہیں کانوں کان خبر نہیں اور مجھے صبح سے پتنگے لگے ہوئے ہیں۔" فرحت کے جلے کٹے الفاظ پہ وہ لمحہ بھر کے لیے چونکے تھے۔ پھر دوبارہ سابقہ کیفیت میں چلے گئے۔

"تو پھر؟" ان کی بے نیازی عروج پہ تھی۔ فرحت کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

"وہ جو آفتیں محو استراحت ہیں انہیں دس سال سے کانوں کان خبر نہیں۔ کیا بتائو گے انہیں کہ اوپر کون آرہا ہے" فرحت نے جلتی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر آہستگی سے بولے۔

"انہیں سچ بتا دوں گا۔ ان کا اصل حوالہ آرہا ہے۔"

☆ ☆ ☆
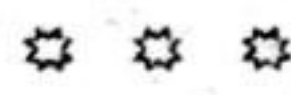
وہ موبائل ہاتھ میں لیے ابھی تک شاکڈ بیٹھا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر وہ اس کا فون بغیر بتائے کاٹ دے گی۔ حالانکہ وہ اتنی ضروری بات کر رہا تھا۔ بات بھی ایسی جو اس کے مطلب اور فائدے کی تھی۔ اور اس نے خرم کی پوری بات سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ یا انجانے میں اس سے ایسا ہوا تھا! یا پھر نیٹ ورک کی وجہ سے؟

وہ خود کو ہزار دلائل دے کر بھی مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ کیونکہ نیلم بہت غائب دماغی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ خرم کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ نہ اس کی اتنی اہم باتوں پہ کوئی رسپانس دے رہی تھی۔

حالانکہ ایک ہفتہ پہلے ہی نیلم نے بذات خود ڈھکے چھپے الفاظ میں خرم سے پوچھا تھا۔

"پھر تمہاری امی کا کیا پروگرام ہے؟ وہ کب تک ہمارے گھر آئیں گی؟" اس نے دو تین مرتبہ پوچھا تھا۔" گو کہ یہ بات کرتے ہوئی وہ بہت جھجک رہی تھی۔ پھر بھی خرم جانتا تھا وہ اندر سے مضطرب ہے۔ خرم اس کے اضطراب کو مزید بڑھانا تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی۔۔۔ اس نے بات کو ذرا گھما پھرا لیا تھا۔

"اماں تو تیار بیٹھی ہیں۔ بس ثوبیہ کے سسرالیوں کی طرف سے کوئی فائنل جواب مل جائے تو۔ اماں تو خود اس قدر بے چین ہیں تم سے ملنے کے لیے۔ میں نے تمہاری تعریفوں کے پل جو باندھ رکھے تھے۔" خرم نے مسکرا کر اسے بتایا تو نیلم کے رخساروں پہ سرخی سی پھیل گئی تھی۔ اور نیلم کا اقرار تو خرم کے لیے ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کے تھا۔ نیلم کا مان جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ خرم کی پچھلے دو سالوں کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ورنہ نیلم کہاں کسی کو گھاس ڈالتی تھی۔ یہ تو خرم کا اخلاق، لگن اور نظر التفات تھا جس نے نیلم کو پسیج دیا اور شاید زیادہ کوششیں نیلم کی امی نے اس معاملے کو کسی کنارے تک پہنچانے کے لیے کی تھیں سو سارا کریڈٹ نیلم کی امی کو جاتا تھا۔

اب خرم کی طرف سے کچھ دیر تھی۔ لیکن آج وہ اسی اہم موضوع پہ بات کر رہا تھا۔ جب نیلم سے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جانے مسئلہ کیا تھا۔ نیلم پچھلے ہفتے سے شہر سے باہر تھی۔ اب واپس آئی بھی تو ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ نجانے مسئلہ کیا تھا؟ کام کا بوجھ، ہمسفر کی تھکان یا کوئی اور وجہ؟

خرم کے دل کو بے چینیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ دل چاہ رہا تھا اڑ کر نیلم کے پاس پہنچ جائے۔ اوپر سے اس کی اپنی اماں نے اتنا دبائو ڈال رکھا تھا کہ حد نہیں۔ وہ جلد از جلد نیلم کے گھر جانا چاہتی تھیں۔ اس سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن نیلم کا رویہ کچھ عجیب ہو رہا تھا اتنا عجیب کہ خرم الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
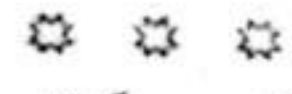
وکیل صاحب کی بات سن کر فرحت جیسے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ پھر ایسی نظروں سے انہیں دیکھا تھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاتھوں سے ردی کا ڈھیر کھینچ کر انہی کے سر پہ دے ماریں۔ کیا واقعی وکیل صاحب سٹھیا گئے تھے۔

اور وہ ان کی جلتی نظروں سے قطعاً" بے نیاز ہو چکے تھے۔ کافی دیر بعد فرحت کے اپنے حواس مجتمع ہوئے تو انہوں نے غیض بھرے لہجے میں سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے ٹوٹ چکا تھا۔

"ارے تمہاری جرات کیسے ہوئی؟ تم جینا، بیلا کو کچھ بتا کر تو دیکھو۔ جن رشتوں کو میں نے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا تھا اور انہیں بتا بھی دیا تھا۔ اب انہی رشتوں کو قبر سے کیسے نکال کر سامنے لائوں گی؟ اور وہ کیسے حقیقت کا تلخ روپ دیکھیں گی۔

تم اپنی سمجھ بوجھ اپنے پاس رکھو۔ اور خبردار اگر زبان کھولی تو۔" فرحت کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو چکا تھا۔ وکیل صاحب نے بیگم کو ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے وہ انہیں عقل سے پیدل لگ رہی تھیں۔

"جانے یہ بال تم نے کہاں سفید کیے ہیں عجیب بد دماغ عورت ہو۔ کیا میرے زبان نہ کھولنے سے سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا؟ کیا جینا، بیلا کچھ بھی نہیں جان پائیں گی؟ اگر میں کچھ نہیں بتائوں گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ اتنی چھوٹی نہیں ہیں جو تم اب انہیں باتوں سے بہلا سکو گی۔ کم از کم اپنی عمر سے زیادہ فہم رکھتی ہیں۔" وکیل صاحب نے انہیں حقیقت کا جو کیا دکھایا تھا وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔

"میں کسی کا سلیہ بھی ان پہ نہیں پڑنے دوں گی۔" انہوں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے۔" وکیل صاحب نے لب بھینچ لیے تھے۔ فرحت بھی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر کافی دیر خاموشی میں گزر گئے تھے۔ بہت دیر کی گمبھیر چپ کو فرحت کی آواز نے ایک مرتبہ پھر توڑ دیا تھا۔

"کیا لینے آرہے ہیں وہ لوگ۔!" وہ عجیب چڑچڑے پن سے کہہ رہی تھیں۔

"اپنے گھر کوئی کیا لینے آتا ہے؟" ان کا انداز بھی تلخ تھا۔

"اب یاد آیا گھر جب اسی گھر کو ٹھوکر مار گئے تھے، تب کیا ہوا؟" فرحت زہرخند ہوئیں۔ وکیل صاحب چپ کر گئے تھے۔ اب بھلا کیا جواب دیتے؟ یہ عورت ہر بات میں کوئی نہ کوئی منفی پہلو نکال لیتی تھی۔

اور جب وکیل صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تب وہ کچھ اور جھنجلا گئی تھیں۔ پھر اچانک خیال آنے پر ان کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ یہی مناسب وقت تھا۔ ابھی بات کر لی جاتی۔ کیونکہ بعد میں کیا خبر وکیل صاحب کا موڈ ہی بدل جاتا۔ گو کہ اس میں بھی تحفظات تو بہت تھے پھر بھی نیلم کی اچھی زندگی کے لیے زہر بھرا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔

بیٹی کی بے رنگ ویران زندگی انہیں پچھتاووں میں دھکیل دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے ساتھ جو بھی ہوا۔ ان ہی کی نادانی اور کم فہمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایک ایسا غیر مناسب وقت میں جذباتی فیصلہ جو عمر بھر کا روگ بن گیا تھا۔ وہ چاہتے بھی تو گزرے وقت کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ لیکن جو وقت ابھی بھی ہاتھ میں تھا اس میں کیے گئے فیصلے سے، نیلم کی زندگی سنور جاتی۔ اسے ایک مستحکم کنارہ مل جاتا تو وہ بھی سکون سے مر

سکتے تھے۔

وکیل صاحب کو گہری سوچوں میں گم دیکھ کر فرحت نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں اور کس کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟ لوہا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ سو فرحت نے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

انہوں نے گلا کھنکھار کے سابقہ تمام تر بحث کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور قدرے نرم آواز میں بولیں۔

"نیلم کے لیے کیا سوچا ہے؟ ان لوگوں نے جب بھی چکر لگایا' رشتہ پکا کرنے کے لیے ہی لگاتا ہے۔ باقی بات تو فون پہ ہو گئی تھی۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ سمجھ دار اور قدر دان۔ باقی ہر بات ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔"

وکیل صاحب نے بیگم کی ساری بات دھیان سے سنی تھی پھر گہرا سانس لے کر اثبات میں سرہلا دیا۔

"میں تو اسی بات پہ بہت خوش تھی۔ نیلم مانی تو سہی۔ ورنہ ہماری زندگی کا کیا بھروسا۔" فرحت آبدیدہ ہو گئیں۔ یہ موضوع ہی ایسا تھا جو وکیل صاحب کا دل بھی کاٹ کے رکھ دیتا۔ انہوں نے بھی بمشکل اپنی آنکھوں کی نمی چھپائی تھی۔ اکلوتی بیٹی اور ایسے نصیب...

وکیل صاحب لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی آنکھوں کا تفکر فرحت کو بھی کچھ بے چین کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وکیل صاحب نے دھیمی بوجھل آواز میں کہا۔

"اور تم ہر بات ان لوگوں سے کلیئر کر لینا۔ کسی گمان میں نہ رہیں۔ ہم تو چراغ آخر ہیں۔ آج بجھے کہ کل بجھے۔ جینا' بیلا کو نیلم کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ ہمیشہ۔"

یہ بات انہیں اس دن سے بے چین کر رہی تھی۔ جب سے نیلم کے لیے رشتہ آیا تھا۔ اس بات کو انہوں نے صاف لفظوں میں بیوی تک پہنچا دیا تھا۔

فرحت بھی اثبات میں سرہلا کر فوراً ہو لیں۔

"ان کو کوئی اعتراض نہیں۔ پھر خرم نے بہت تسلی دی ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ بہت احساس کرنے والا ہمدرد۔ ورنہ آج کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔

"یہ تو عنایت ہے ان کی اور ہماری بیٹی کو اس کے صبر کا صلہ مل گیا۔" وکیل صاحب نے رنجیدگی سے کہا تھا۔ پھر اچانک خیال آنے پر بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔

"اور تم دوسرے پہلو کو بھی نظر انداز مت کرو۔"

ان کا اشارہ سمجھ کے فرحت نے گہری سنجیدگی بھری خاموشی کو توڑا تھا۔

"میں اس پہلو کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔ پہلے تو ان لوگوں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ نقوی صاحب سے جب بھی پوچھا' انہوں نے کہا تین چار سالوں سے رابطہ نہیں پھر نیلم بھی تو اب ہی مانی ہے۔ پہلے ان کمینوں کا اتا پتا پوچھ کے کرنا بھی کیا تھا ضرورت تو اب پڑی ہے۔ جب نیلم نے ہمارے بڑھاپے پہ ترس کھا کر حامی بھری۔" فرحت کا ان لوگوں کے ذکر پہ لہجہ زہر آلود ہو گیا تھا۔ وہ کمینے خود غرض لوگ جنہوں نے ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی تھی۔ تباہ کر دی تھی۔ اس کی زندگی پہ ہمیشہ کے لیے خزاں طاری کر کے چلے گئے تھے۔ نیلم مسکرانا بھول گئی تھی۔ زندگی جینے کا قرینہ بھول گئی تھی۔ نیلم خود کو بھول گئی تھی۔

"اور جینا' بیلا۔ وہ مان جائیں گی کیا؟" وکیل صاحب نے اندر کی بے چینی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میرا "دردسر" ہے۔" فرحت کا اطمینان قابل دید تھا۔ وکیل صاحب پھر کسی اذیت بھری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پرانے عکس لہرانے لگے۔ یادوں کا ایک پر درد سلسلہ آنکھوں کی چلیوں پہ رنگ چھوڑ رہا تھا۔ گہرے کالے اور بھدے رنگ۔

انہیں کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ جو بھولا تو پہلے بھی کبھی نہیں تھا۔ اور ان دنوں تو اور بھی شدت سے یاد آتا۔

"مجھے نوشابہ اور تیمور سے کوئی گلہ نہیں۔۔۔ وہ مزاجاً" ہی ایسے تھے۔ اصل دکھ تو ثقلین نے دیا تھا۔ ایسا گیا کہ پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔۔۔ نہ خط' نہ فون نہ کوئی تعلق کوئی ایسا بھی کرتا ہے کوئی اس طرح سے بھی کرتا ہے۔ میری بیٹی کو عمر بھر کے لیے دار پہ چڑھا دیا۔" ان کی آنکھوں میں گدلا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ تب فرحت نے بے ساختہ نظر چرالی تھی۔ وہ وکیل صاحب کے ایسے شکووں سے۔ جو انہیں ثقلین سے بے بہا تھے ایسے ہی نگاہ چرا لیتی تھیں۔

"آہ۔۔۔ یہی تو میں تمہیں سمجھاتی تھی۔ خود غرض اور مطلبی لوگ ہیں۔ دیکھا' کیسا خنجر گھونپ دیا ہماری پشت میں بغیر بتائے اندر ہی اندر انتظامات کروائے اور چل دیے۔ بتایا تک نہیں۔ جیسے ہم انہیں روک ہی نہ لیتے۔" فرحت دل کی جلن کو زبان پہ لے آئی تھیں۔

"اور اب ان کی واپسی کا کیا مطلب ہے؟" انہوں نے چمک کر کہا۔ وکیل صاحب بے خیالی میں بیوی کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ جیسے ان کی بات سمجھنا چاہتے ہوں اور جب انہیں فرحت کی بات سمجھ میں آگئی تو ایسے ہی دل میں خوش گمانیوں کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ ان کی گدلی آنکھیں لحظہ بھر کے لیے مسکرا دی تھیں۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا جو ان کا دل سوچ رہا تھا۔ چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔

"کیا خبر' تعلقات کی بحالی۔۔۔" اور ابھی وہ اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن پہنانا چاہتے ہی تھے جب فرحت نے بے ساختہ چلا کر ان کی بات کاٹ دی تھی۔ ان کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا تھا۔

"ایسا تو میں مر کر بھی نہیں سوچ سکتی۔" وہ زہر خند ہی اٹھی تھیں۔ معاً "گیٹ پہ ایک جانی پہچانی پکار نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"جینو' بیلو۔۔۔" نیلم اونچی آواز میں طبل بجا رہی تھی۔ فرحت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

سفید انڈے جیسے تالاب میں نیلگوں پانی کی لہر بہہ رہی تھی۔ تالاب کے کناروں پہ سفید چکنے لوہے کے گرل نما کنارے تھے۔ جن کے ایک ایک کونے میں سفید بگلے سر جھکا کر بیٹھے کورس میں کچھ گا رہے تھے۔ آسمانوں سے سنہری پریاں کھلکھلاتی ہوئی زمین پہ اتر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں سنہری ڈولز تھیں۔ ایک رنگ برنگے ربن والی سائیکل تھی اور ڈھیر سارے چاکلیٹس' کینڈیز' کوکیز' جیلی بیلی اور نجانے کیا کیا۔

ابھی وہ ہاتھ بڑھا کر پریوں سے سارے تحائف وصول کرنا چاہتی ہی تھی جب اچانک کسی نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ اور مندی مندی آنکھوں سے اپنے اوپر جھکی جینا کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا گال تھپتھپا کر زبردستی جگا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بیلا کے حواس بحال ہوئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آنکھیں مسل مسل کر اس نے لمبی سی جمائی کو روکا تھا پھر قدرے خفا خفا لہجے میں بولی۔

"اتنی جلدی کیوں جگا دیا؟" اس پہ سستی سوار ہو رہی تھی۔ جیسے ہی بیلا نے دوبارہ لیٹنا چاہا تھا۔ جینا فوراً" آڑے آگئی۔

"بری بات' اب نہیں سونا اور سو سو کے تم مر جانا باہر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔" جینا نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا تھا۔ بیلا بری بری شکلیں بناتی اٹھ گئی تھی۔

"تھوڑا اور تو سو لینے دیتیں۔ سنہری پریاں مجھے گفٹ دینے والی تھیں۔ تم خوابوں میں بھی مجھے کچھ لینے مت دینا۔" بیلا روہانسی ہو گئی تھی۔

"بیلو کی بچی! تم سپنوں میں مری رہو۔ باہر دیکھو' سوما پوری کالونی میں ریڈ اسپورٹس کار بھگا رہی ہے۔" جینا شاید باہر کا ایک چکر لگا کر آئی تھی۔ اور ابھی سوما کی اسپورٹس کار کے لیے رشک بھرے جذبات کے ساتھ بہن کو بتا رہی تھی۔ لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔ وہ تو سائیکل کے لیے ترس رہی تھیں۔ سوما اسپورٹس کار بھی لے آئی۔ بیلا کا دل بھی مچل اٹھا۔ وہ بھی اسپورٹس کار دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے بجھ سی گئی۔

"سوما کے پاپا ہیں۔۔ وہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ نیا لے لیتی ہے۔ ہمارے کون سا پاپا ہیں؟ نہ ہمیں کوئی گفٹ ملتا ہے اور نہ ہم کسی ہل اسٹیشن گھومنے پھرنے جاتے

ہیں۔ کاش ہمارے بھی پاپا ہوتے۔ کاش ہمارے پاپا نہ مرتے۔" بیلا کی نیلی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

"لیکن سوہا کی اسپورٹس کار اس کے پاپا نہیں لائے۔" جینا نے فوراً" ٹوک کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

"پھر؟" بیلا نے آنکھیں رگڑ کر حیرت سے کہا۔

"اس کے کینیڈا سے انکل آئے ہیں۔ وہی اسپورٹس کار، بیلی اور ڈھیر سارے چاکلیٹس اور جیولز لائے ہیں۔" جینا نے ڈیٹیل بتائی تھی۔ یقیناً" وہ سوہا سے ساری رپورٹ لے کر آئی تھی اور سوہا کی شوخیوں، غرور پہ بہت پکی ہوئی بھی تھی۔ اسے سوہا کی نخوت بھری بات پہ ابھی تک غصہ تھا۔

"جینا! تمہارے انکل بھی کینیڈا ہوتے تو تمہارے لیے بھی مزے مزے کی چیزیں آتیں۔" اس وقت بیلا کے سامنے وہی باتیں دوہرا کر جینا اپنا غصہ نکال رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمکیلا پانی بار بار آرہا تھا۔

"سوہا پراؤڈ کیوں نا ہو۔ اس کے پاس ممی، پاپا، نانی، نانا، دادی، دادا سب لوگ موجود ہیں۔ وہ پاس ہو، اس کی سالگرہ ہو۔ سب اسے الگ الگ گفٹ دیتے ہیں اور اب ایک امیر سے انکل بھی اسے مل گئے۔ ان کی ہنڈا سوک پہ سوہا پورا شہر گھوم کر آئی تھی۔ ڈھیر ساری شاپنگ بھی کی۔ اس کے انکل بہت نائس ہیں سوہا اسپورٹس کار چلا رہی تھی تو وہ پاس کھڑے تھے۔ اسے گائیڈ کر رہے تھے۔" جینا کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کا دل بھی دکھ سے بھر گیا تھا۔

"کاش ہمارے بھی کوئی انکل ہوتے۔" جینا کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"انکل نہ سہی ہمیں پاپا تو مل ہی جائیں گے۔" بیلا نے اپنے تئیں بڑی سمجھ داری کی بات کی تھی۔ جینا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہتی ہو۔

"امی بتا رہی تھیں۔ جلدی ہمارے اچھے والے پاپا آجائیں گے۔ پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں خوب لاڈ کریں گے اور خوب مزہ کرائیں گے۔" بیلا نے مزید بھی بتایا تھا۔ وہ فرحت کی باتیں دوہرا رہی تھی۔

"کون سے؟" جینا بھی چونک گئی تھی۔

"ان کا نام خرم ہوگا۔" بیلا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہی جو نیلی کے ساتھ ایک دفعہ گھر بھی آئے تھے؟" جینا کی آواز روکھی سی تھی۔ بیلا نے سر ہلایا۔

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کے ایک مرتبہ پھر سوہا کے انکل کی پرسنالٹی میں ڈوب گئی تھی۔ سوہا کے انکل زیادہ اچھے تھے اور انہوں نے آواز دے کر جینا کو روکا بھی تھا۔ لیکن وہ اتنی کنفیوز ہوئی کہ بھاگ کر گھر آگئی۔

"سوہا کے انکل مجھے بہت نائس لگے۔ بہت سویٹ اینڈ پولائٹ۔ انہوں نے مجھے کینڈی دی لیکن میں نے نہیں لی۔" وہ بہن کو ہر بات بتاتی تھی۔ ہر بات شیئر کرتی تھی۔ ابھی بھی ایک ایک بات بتا رہی تھی۔

"کاش، سوہا کے انکل ہمارے انکل بن جائیں۔" جینا کا لہجہ حسرت آمیز تھا۔ ایسی حسرت جس میں کلیجے ٹوٹ رہے تھے۔ اور دروازے کے باہر کھڑی جینو بیلو کو سرپرائز دینے کے چکر میں نڈھال سی نیلم کے دل میں بھی کلیجے سے ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ ہینڈل کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ وہ اتنی سی کوشش بھی نہ کرتی تو زمین بوس ہو جاتی۔ "سوہا کا انکل! تو کیا وہ آگیا تھا سچ مچ واپس آگیا تھا تیمور واپس آگیا تھا۔" نیلم کی آنکھوں سے دھواں نکلنے لگا۔ نیلم کو غیر متوقع دیکھ کر وقتی طور پہ جینا، بیلا سب کچھ بھول گئی تھیں۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ نیلم واپس آگئی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں۔ نیلم کے لائے تحفوں کو انجوائے کر رہی تھیں۔ اور اس وقت بیرونی ماربل کی دھلی دھلائی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر تکے، فرائز اور ونگز کھا رہی تھیں۔ کوک کے ٹن انہوں نے نچلے اسٹیپس پہ رکھے ہوئے تھے۔

اور ساتھ باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع تھا اور موضوع گفتگو وہی سوہا اور اس کے نئے انکل۔ اب چار پانچ دن تک انکل ہی ڈسکس ہونے تھے۔ جینا بیلا



کی یہ بڑی پرانی عادت تھی۔ ایک ہی بات کو کئی کئی دن تک سوچنا اور دوہراتے رہنا۔

بچیوں کے چہروں پہ جگمگاہٹ دیکھ کر نیلم کے دل میں اک گویا سکون اتر رہا تھا۔ سفر کی ساری تھکان جیسے جاتی رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر نئی تازگی سی بھر گئی ہے۔ وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ پھر اسی نے کڑک سی چائے کیا پلائی تھی نیلم نے دوسرے ہی لمحے کمر کس لی۔ پورا گھر گندا ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا یسماں نے آج بھی بہانہ بنا کر چھٹی ماری تھی۔ رات کو شاید طوفان آیا تھا۔ اور سہ پہر تک پورا گھر کوڑا دان بن گیا۔ نیلم سے اتنی گندگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک انتظار کیسے کرتی؟

پھر جو اس نے بجلی آتے ہی پائپ لگایا تو پورا گھر دھو کر رکھ دیا۔ پانی دیکھ کر جینا بیلا بھی مچل گئی تھیں۔ شوق شوق میں ہی دونوں نے وائپر پکڑ لیے تھے۔ سارے گھر سے پانی بھی صاف کیا اور پوچا بھی لگا دیا۔ نیلم کھڑکیاں دروازے جھاڑ کر فارغ ہوئی تو فرش چم چم کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی امڈ آئی تھی۔

"ارے، میری بچیاں تو بڑی ہوگئیں۔ اتنا ڈھیر سارا کام کر دیا۔" وہ ان دونوں کے بے انتہا لمبے بالوں کو سہلا کر مسکرا رہی تھی۔ جینا، بیلا اتنی تعریف پا کر خوش ہوگئیں۔

پھر نیلم نے دونوں کو باری باری نہلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے تھے۔ بال بنائے، جوتے انہوں نے خود ہی پہن لیے۔ اب دونوں ریڈی ہو چکی تھیں اور باہر جانے کے لیے پر بھی تول رہی تھیں۔

"ہم سوہا کے گھر جائیں۔"

"نہیں۔" نیلم نے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ وہ ان دونوں کو سوہا کے گھر تو کیا گلی میں بھی جانے نہ دیتی۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس نے از خود تیمور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ تیمور نہ صرف آچکا تھا بلکہ ابھی تک سوہا کے گھر موجود تھا اور نیلم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے حقیقت سے نگاہ چراتی پھر رہی تھی۔ کتنی بھولی تھی وہ۔ اگر جینا، بیلا سوہا کے گھر نہ جاتیں۔ کالونی میں نہ نکلتیں تو اس سے کیا فرق پڑنا تھا۔ تیمور خود اس گھر میں ڈنکے کی چوٹ پہ آسکتا تھا۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا۔ کوئی بھی اسے یہاں آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور نیلم کی اوقات کیا تھی وہ کیسے اسے روک سکتی تھی۔

اور نیلم کو بھی کیسی کیسی خوش فہمیاں لاحق تھیں۔ جس شخص نے دس سال تک ان بچیوں کی خبر نہیں لی تھی۔ جن کے ناموں سے بھی شاید وہ واقف نہ ہو۔ جنہیں خرچے کے نام پر اس نے کبھی ایک پھوٹی کوڑی نہ دی ہو۔ ان بچیوں کو سامنے پاکر کیسے اس کا پتھر دل پسیج سکتا تھا، کیسے وہ ان کی طرف ملتفت ہو سکتا تھا؟ پھر بچیوں کو خواہ مخواہ گھر میں روک کر ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے نیلم نے سوچا وہ ان دونوں کو سوہا کے ساتھ کھیلنے بھیج دیتی ہے۔ پھر خود ہی اپنے خیال کو جھٹک دیا تھا۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا وہ تیمور کی موجودگی میں بچیوں کو نقوی انکل کے گھر بھیجے۔

وہ کیا سوچتا ہوگا۔ نیلم جان بوجھ کر بچیوں کو اس کے سامنے بھیج رہی ہے تاکہ وہ ان پر نظر کرم ڈالے، ہرگز نہیں قیامت تک نہیں، وہ تو مر کے بھی گوارا نہ کرتی کہ تیمور اس کی بچیوں کو دیکھتا بھی۔ بلانا اور پیار کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ تو تیمور کا سایہ بھی ان دونوں پہ نہ پڑنے دیتی۔

اور اس وقت نیلم ایسی ہی سوچوں کے اژدہام میں کھوئی تھی جب جینا نے نیلم کا کندھا ہلا کر اسے چونکایا تھا۔

"بات تو سنو نیلی!" جینا کا انداز خاصا بے صبرا تھا۔ وہ امی، ابو، یسماں وغیرہ کی دیکھا دیکھی اسے نیلی کہہ کر بلایا کرتی تھیں۔ امی بھی نہیں ٹوکتی تھیں۔ بلکہ آرام سے کہہ دیتیں۔

"اچھا ہے ویسے بھی تم ان کی ماں کہاں سے لگتی ہو صرف سولہ سال بڑی۔ اتنا فرق تو عموماً" بہن بھائیوں میں بھی ہوتا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" نیلم نے بے خیالی میں کہا۔ اس

کی سوچیں بہت منتشر تھیں۔ بھٹک بھٹک کر نقوی صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھیں۔ دل بڑا پریشان اور بوجھل تھا۔ کیا تیمور کا آنا بے مقصد تھا وہ فیملی سمیت کیوں واپس آگیا؟ کیا وجہ تھی اور اس کی بیوی بچے وہ کہاں تھے۔

"سوہا کے انکل آپ کا پوچھ رہے تھے نیلی! کہتے، تمہاری نیلی پیلی کا کیا حال ہے؟" جینا نے اسے گم صم دیکھ کر ہلایا تھا۔ نیلم جیسے لمحوں میں سنبھل گئی تھی۔ پھر اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

"وہ کہاں ملا تمہیں، مطلب سوہا کے انکل کہاں ملے تمہیں؟" نیلم کی آواز جیسے پھٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

"باہر روڈ پہ وہ سوہا کو بیلی اڑانا سکھا رہے تھے۔ نیلی! ہمیں بھی بیلی چاہیے۔ جو بہت دور تک فلائی کر سکتا ہو۔" جینا نے چہکتے ہوئے اپنی فرمائش اس تک پہنچائی تھی۔ نیلم غائب دماغی سے جینا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ ذرا جھک کر جینا کے قریب آئی۔ پھر اس نے جینا کے دونوں پھولے پھولے گالوں کو پیار سے سہلایا۔ پھر بیلا کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ وہ دونوں اب اس کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ نیلم کو اک گونا تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ پھر اس نے ان دونوں بہنوں کو سمجھایا۔

"دیکھو بیٹا! کسی کی چیز کو دیکھ کر امپریس ہونا اور بات ہے۔ اس کے حصول کی خاطر کوشش کرنا اور بات۔۔۔ میں جلدی تم دونوں کو سائیکل لے دوں گی۔ لیکن پھر تم اور فرمائش کرو گی۔ وہ پوری کرنے کے چکر میں اک نئی فرمائش میں اتنا افورڈ نہیں کر سکتی۔" نیلم نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانا چاہا تھا۔ اور اس کے سمجھانے پہ ان دونوں کے چہروں پہ بے زاری اتر آئی تھی۔

"کوئی نئی بات سمجھاؤ نیلی! یہ باتیں سن سن کر ہم بور ہو چکے ہیں۔" ان کا لہجہ اتنا روکھا اور بے زار تھا کہ نیلم جہاں کی تہاں ٹھہری گئی تھی۔

"آپ ہمیں کچھ لے کر نہیں دیتیں۔ گھمانے نہیں لے کر جاتیں۔ ہم نے کبھی ہوٹلنگ نہیں کی۔ ہر وقت سمجھاتی رہتی ہیں۔" بیلا اور جینا دونوں ایک ساتھ شروع ہو گئی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور نا اس شکوے میں کوئی نیا پن تھا پھر بھی نیلم کو شدید تکلیف ہوئی تھی۔ کیا واقعی ہی جینا بیلا اس سے خوش نہیں تھیں وہ ان کی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی، وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستی تھیں۔ اور ان کی زندگی میں کتنے ڈھیر سارے خلا تھے۔

"ہم اس سنڈے سندباد چلیں گے۔" اپنے تئیں نیلم نے اچانک انہیں بتا کر خوش کرنا چاہا تھا۔ گو کہ اس سنڈے لاتعداد رکے ہوئے کام سرانجام دینے تھے، لیکن بچیوں کی خاطر ایک اتوار سابقہ روٹین نہ بھی برقرار رہتی تو کیا تھا۔ دراصل وہ ان دونوں کا ذہن بٹانا چاہتی تھی۔ انہیں سوہا کے انکل اور سوہا کو دیے جانے والے گفٹس کے فیز سے نکالنا چاہتی تھی۔

"نہیں بالکل نہیں، پچھلی دفعہ بھی آپ ہمیں رکشہ پہ سندباد لے کر گئی تھیں سوہا نے تب اسکول جا کر سب فرینڈز کو بتایا تھا۔ سب بچوں نے ہمارا اتنا مذاق اڑایا۔" جینا نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تو کب سے چپ بیٹھی بیلا بھی بول پڑی تھی۔

"نیلی! ہم چھوٹی سی مہران نہیں لے سکتے۔" اس کی بیٹیوں کے خواب اور اونچی اونچی فرمائشیں نیلی کا دماغ ابل پڑا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"مہران خرید لی تو کمتا کرولا چاہیے۔ پھر بی ایم ڈبلیو بڑے نواب کی بیٹیاں ہو، نا۔" نیلم نے امی والے الفاظ دوہرا کر ان دونوں کو اتنے زوردار لہجے میں جھڑکا تو وہ دونوں منہ پہ ہاتھ رکھ کر بمشکل چیخ دبائے بلک بلک روتی ہوئی اندر بھاگ گئی تھیں اور ان کے الفاظ ابھی تک نیلم کا دل پھاڑ رہے تھے۔

"کاش، ہمارے پاپا نہ مرتے۔"

نیلم کو روتی ہوئی یہ آواز اذیتوں کے نخلستان میں لے جا رہی تھی۔ دل میں درد کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ پیروں میں زخم اکھڑ رہے تھے۔ سلے ہوئے ناسور پھر سے پھٹ رہے تھے۔ پیروں کے آبلے پھوٹ رہے تھے۔ باد صرصر کے ایسے تند جھکڑ چلے تھے جو بہت کچھ اڑا کر لے گئے۔

یہ بھلاوں کا طوفان تھا جو دور بہت دور اڑا کر لے گیا۔ اس وقت کی نگری میں جو خود صحرا صحرا تھی۔ جہاں ریت اڑ رہی تھی۔ دھند تھی۔ جس کے پیچھے سارے عکس بھی دھندلے تھے۔ غبار میں گم تھے۔ ہر تصویر ادھوری تھی۔ کوئی تصویر مکمل نہیں تھی۔ ہر رشتہ بے جان تھا، سرد اور اجنبی تھا۔

پردے کے پیچھے وہ منظر جو جینا بیلا کی نگاہ سے مخفی تھے۔ اگر وہ جان جاتیں تو۔۔؟ اگر انہیں وہ سب حقیقتیں پتا چل جاتیں جو ان کی نظر سے اوجھل تھیں جنہیں ان سے چھپا دیا گیا تھا تب؟ تب وہ دونوں یہ کہنے پہ ضرور مجبور ہو جاتیں کہ۔۔۔

"کاش، ہمارے پاپا مر چکے ہوتے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دن سرما کے مختصر دنوں میں شمار ہوتے تھے۔ یوں چڑھتے اور یوں لمحوں میں ڈھلتے۔

صبح طلوع ہوتی اور پھر شام پھیلتے بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ دھوپ منٹوں میں سمٹ کر دیواروں سے چپکتی اور غائب ہو جاتی ان دنوں "آشیانہ ثقلین" پہ کلنگ نامی نیالا پرندہ بڑی لمبی پرواز کیا کرتا تھا اور اس کی ناگوار آواز پرانی طرز کی کھڑکیوں سے اندر گھستی اور آشیانہ کے مکینوں کی سماعتوں میں ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگاتی تھی۔

فرحت کو کلنگ کی آواز سے بڑی شدید قسم کی چڑ تھی۔ وہ اس لمبی گردن والے قاز نما پرندے کو منحوس کہا کرتی تھیں جس نے خاص طور پر دوپہر کا آرام محال کر رکھا تھا۔ گو کہ سردیوں کی دوپہریں ہوتی نہیں تھیں پھر بھی آشیانہ کے اوپر نیچے والے مکین قیلولہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چاہے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ملتا، آنکھ ضرور لگائی جاتی تھی۔ اوپر اور نیچے والوں کا یہ سانجھا رواج تھا۔ دونوں گھروں میں اولاد کا خاصا فقدان تھا۔

اوپر ثقلین علوی کا ایک بیٹا تیمور، جو انتہا کا لاپروا، بے نیاز، لاابالی، کھلنڈرا سا تو عمر انیس سالہ ابھی ابھی جوان ہوتا منچلا سا لڑکا تھا۔ کرکٹ، ٹینس، والی بال جس کا جنون اور شوق تھا۔ پڑھائی میں بس سو سو۔ بھی دوستوں کی مہربانی سے تو کبھی نقلیں مار کے، مر مرا کے پاس ہو ہی جاتا تھا۔ پڑھائی اس کے لیے بڑی غیر ضروری قسم کی چیز تھی۔ جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ البتہ مستقبل کے لیے اس کا لاابالی پن ہر سننے والے کو ورطہ حیرت میں ضرور ڈال دیتا تھا۔ جو لڑکا تعلیم کے لیے اتنا غیر سنجیدہ تھا وہ مستقبل کے لیے اتنا سنجیدہ کیسے ہو سکتا تھا گو کہ فی الحال وہ باپ کی کمائی پہ عیش کر رہا تھا، تاہم امیر ہونے کا دیرینہ شوق ابھی زندہ سلامت تھا۔ حالانکہ ان کے حالات نیچے والوں سے خاصے بہتر بلکہ بہترین تھے۔

چاچو کی جاب ابو کی وکالت سے بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اپنا پورشن بھی حال ہی میں تعمیر کروایا تھا اور نیا فرنیچر بھی منگوا کر پورا گھر ڈیکوریٹ کر لیا اور امی، نوشابہ چاچی کی لاشاخیوں پہ ہمہ وقت کڑھتی رہتی تھیں۔

"اس عورت کے ہاتھ میں تو سوراخ ہیں۔ کما اڑا رہی ہے سب کچھ۔ جمع جتھا کرنے کا کوئی پتا نہیں۔ برا وقت کبھی بھی آ سکتا ہے۔" امی کے فرمودات پہ نوشابہ چچی بغیر غصہ کیے ہنستیں اور ہر بات قہقہوں میں اڑا دیتی تھیں۔

"چار دن کی زندگی ہے۔ عیش و عشرت میں گزار دینی چاہیے۔" انہیں ہر بات پہ قہقہہ لگانے کی عادت تھی۔ ان کے خیالات اپنے اکلوتے لخت جگر سے بہت ملتے تھے۔ وہ بھی پیسہ اڑانے کا شوقین تھا، کمانے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ چاچو کما لاتے تھے یہ دونوں اڑا دیتے اور یہ کام پوری دل جمعی سے کرتے تھے۔

نیچے والوں کے حالات اوپر والوں کی نسبت خاصے بدحال تھے۔

نچلا پورشن مرسلین علوی کی رہائش گاہ تھی۔ ان کی اکلوتی بیٹی نیلم جو نہایت سنجیدہ مزاج خاصی سگھڑ اور کم

گو قسم کی لڑکی تھی۔ پڑھائی میں وہ بھی بس ٹھیک تھی۔ لیکن یہ تھا کہ ذہین نہ ہونے کے باوجود وہ محنتی بلا کی تھی۔ ہر وقت پڑھتی رہتی۔ کتابوں میں سر دیے رکھتی۔ کچن میں جاتی تب بھی کتاب ہمراہ ہوتی۔ یوں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اچھے گریڈ سے ہی لیتی تھی۔

نیلم تیمور سے تین سال چھوٹی تھی۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تو بہت دور کی بات دوستی تک نہیں تھی۔ کزن ہونے کے ناطے وہ اس پہ اپنے کام نکلوانے کے لیے رعب ضرور ڈال لیتا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنی بہن نہیں تھی۔ نوشابہ چچی سدا کی آرام طلب خاتون تھیں سو وہ یہ دیکھ کر خواہ مخواہ بیمار ہو جاتی تھیں۔

یوں تیمور کے سارے کام نیلم کے ذمے تھے۔ حتیٰ کہ نوشابہ اور ثقلین کی اکثر ذمہ داریاں بھی اسی کے کندھوں پہ تھیں اور نیلم سدا کی فرماں بردار جیسے کوئی کتنا آرام سے کرتی جاتی۔ اور امی کو اس کی یہی حضوری سخت تاؤ چڑھتا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ٹوکتی رہتی تھیں۔

"نوکر نہیں ہو تم نوشابہ اور اس کے آوارہ بیٹے کی، اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ بھاگ بھاگ کر اوپر جانے کی ضرورت نہیں۔"

امی کو نوشابہ چچی سے سخت چڑ تھی۔ اور اسی حساب سے تیمور بھی انہیں انتہائی ناپسند تھا۔

کافی عرصے بعد نیلم کو پتا چلا تھا کہ امی کو نوشابہ چچی سے کیوں چڑ تھی اور ان دونوں کے تعلقات اتنے خراب کیوں تھے؟ دونوں میں روایتی جیٹھانی، دیورانی والی رنجش بدرجہ اتم موجود رہتی تھی۔ نیلم نے تھوڑا اور غور کیا تو اندازہ ہو گیا تھا۔ نوشابہ کی طرف سے تو نہیں البتہ اس کی امی بات بے بات نوشابہ سے اختلاف رکھتی تھیں۔

ہر وقت ان پہ طنز کرتیں۔ ٹوکتی رہتی تھیں اور نوشابہ جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑتیں۔ ہر تکلیف دہ جملے کو باتوں ہی باتوں میں اڑا دیتی تھیں۔ کبھی انہوں نے کسی طعنے کو کھینچ تان کے لمبا نہیں کیا تھا۔

نوشابہ کا میکہ بھی اسی اسٹریٹ پہ آباد تھا۔ نقوی انکل، نوشابہ کے سگے بھائی اور تیمور کے ماموں تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا وقاص، تیمور کا دوست تھا۔ آوارہ گردیوں میں وہ دونوں شانہ بشانہ رہتے تھے، تاہم وقاص پڑھائی میں بہت سنجیدہ تھا اور تیمور کو سنجیدگی چھو کر نہیں گزری تھی۔

تیمور ہلے گلے کا شوقین، ہنگامہ پرور، سیاحت کا دلدادہ تھا۔ گھر میں ہوتا تب بھی ہنگامہ بپا رکھتا تھا۔ اس کے دوست بے دھڑک گھر میں آ گھسے۔ اوپر والے پورشن میں گھستے میوزک چلا لگانے لگتے اور وہ اودھم مچا کہ حد نہیں۔ پھر اچھے ہوٹلز سے کھانا منگوایا جاتا تھا۔ چائنیز، اٹالین، اسپائسی، کرسپی فوڈز۔ کیونکہ چاچی تو پکانے کی ہمت کبھی نہ خود میں لاتیں۔ انہیں کچن میں جانے سے ہارٹ اٹیک ہونے لگتا تھا۔ یوں باہر سے رنگ رنگ کے کھانے منگوائے جاتے۔ برگر، پزا، ونگز، فرائز، جنک فوڈ کی ہر ورائٹی۔ چاچی تیمور کے سچے دوستوں کی دل کھول کر خاطر مدارات کرتی تھیں، یہ سچ تھا کہ نوشابہ کا ہاتھ اور دل بہت کھلا تھا۔ وہ ٹرالی بھر بھر کے تیمور اور اس کے دوستوں کو ڈرائنگ روم میں بھجواتی تھیں۔ پھر ایک خوب صورت ٹرے سج کر نیچے بھی آ جاتی۔ نیٹ کے رومال سے ڈھکی جس کے نیچے زنگر، لزانیہ، کریزمہ میں سے کوئی نہ کوئی ورائٹی ہوتی۔ ونگز، کباب، لیگ پیس، فش اسٹکس اور جانے کیا کیا۔

نیلم نے زندگی میں ایسی چیزیں نہیں کھائی تھیں جو نوشابہ آئے دن چپکے سے اسے پکڑا جاتیں۔ فرحت سے چوری چھپے اور اگر فرحت کو بھنک بھی پڑ جاتی تو نیلم کی دھنائی ہوتے لمحہ بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ نہ نوشابہ کو پسند کرتی تھیں نہ ان کے گھر کی کسی اور چیز کو۔

وہ وکیل صاحب کو بھی اپنے چھوٹے بھائی سے زیادہ ملنے ملانے پہ ٹوکا کرتی تھیں۔ اور نیلم پہ تو کڑی نگاہ رکھتیں۔ ان کی نظر میں تیمور بلا کا آوارہ مزاج غنڈا ٹائپ لڑکا تھا۔ جس سے بچ کر رہنا بہت ضروری تھا۔ نیلم کو خود بھی بھاگ بھاگ کے اوپر جانے کا کریز نہیں تھا۔ جب بھی نوشابہ آواز دیتیں۔ کوئی کام بتاتیں تب



نیلم کم از کم انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ نیچے آ کر امی سے وہ جھاڑ پڑتی کہ حد نہیں۔

اسے نوشابہ بہت اچھی نہ سہی بہت بری بھی نہیں لگتی تھیں۔ موسم گرما اسٹارٹ ہوتا تو امی اور نیلم کے لیے اچھی لان کا سوٹ لے آتیں۔ اور یہ ان کی بہت پرانی عادت تھی۔ اور نیلم کو یاد تھا جب بھی نوشابہ انہیں کپڑے پکڑا کر اوپر جاتیں۔ پیچھے امی کی بڑبڑاہٹیں کانوں میں سوراخ ڈال دیتی تھیں۔

"یہ سستا گھٹیا سا کپڑا اٹھا لائی ہے۔ خود برینڈز کے سوٹ پہنتی ہے۔ گل احمد اور الکرم کی لان سے نیچے نہیں آتی۔ اور ہمیں یہ گند اٹھا کر دے گئی۔"

امی شاپر اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگتی تھیں۔ تب کتاب میں سر گھسائے بیٹھی نیلم سے رہا نہ جاتا تھا۔ وہ نوشابہ کے لائے نفیس کپڑوں پہ ہاتھ پھیر کر امی کو سادگی سے بتاتی۔

"امی! یہ سوئس لان ہے۔ بہت اچھی۔" فرحت بیٹی کے جواب پر جز بز ہو جاتی تھیں۔ پھر اسے گھور کر دیکھتیں۔ اور ایک نیا نکتہ اٹھا لاتی تھیں۔

"اپنی امارت کا رعب جھاڑتی ہے۔ تمہارے باپ اور چچا پہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ بہت اچھی ہے اور ہم بہت برے۔" فرحت کی اپنی ہی الگ سی منطق ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی کی اچھائی کو مثبت پہلو سے دیکھتی ہی نہیں تھیں۔ نیلم تب بے بس ہو جاتی "اور یہ سوٹ دے کر تمہیں دانہ ڈال جاتی ہے۔ پھر پورا سال نوکروں کی طرح کام لیتی ہے اس کے پاس انسانوں کو دام میں کرنے کے بڑے بڑے گر ہیں۔

تمہارے چچا کو بھی پھنسا لیا تھا۔" فرحت بلبلا کر کہتیں۔ اس دن نجانے کس موڈ میں انہوں نے نیلم کو اپنی بے زاری کا قصہ سنا ڈالا جو انہیں نوشابہ کے وجود سے تھی۔

ہوا کچھ اس طرح سے تھا کہ "ثقلین چاچو کی رسمی بات چیت اس کی چھوٹی خالہ سے طے تھی۔ چاچو خاندان کے بہت لائق لڑکے تھے۔ امی نے بالا ہی بالا چاچو کو اپنی بہن سے منسوب کر لیا تھا۔ لیکن چاچو، نوشابہ کو چاہتے تھے۔ آپس میں رشتہ داری تو نہیں تھی تاہم ہمسائیگی ضرور تھی۔ یوں چاچو نے امی کا جوڑا ہوا رشتہ توڑ کر نوشابہ سے شادی کی، تو امی اور چاچو کے درمیان ٹھن گئی۔ یہ اختلاف نوشابہ کے آ جانے بہت گھلنے ملنے کی کوشش کرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ امی نے کبھی یہ گانٹھ دل سے نہیں کھولی تھی۔ کبھی چاچی کو اندر سے قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ انہیں نظر انداز ہی کیا تھا۔ میسنی، گھنی، ہوشیار ہی سمجھا تھا۔

گو کہ نیلم کی چھوٹی خالہ بیاہ کر قطر چلی گئی تھیں، انہوں نے کبھی عید کے عید بھی فون نہیں کیا تھا پھر بھی امی ابھی تک بہن کا صدمہ دل سے لگائے، کدورتوں کو ختم کرنے سے باز نہیں آئی تھیں۔ چھوٹی خالہ اپنے گھر میں خوشحال زندگی گزار رہی تھیں۔ اور امی نے اپنے گھر میں ابھی تک اسی پرانے قصے کا رونا ڈال رکھا تھا۔

پھر نوشابہ نے آتے ساتھ ہی چاچو کو بیٹا دے دیا اور فرحت کے ہاں نیلم شادی کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔ وہ تیمور سے تین سال چھوٹی تھی۔

امی کو نوشابہ کی اچھی قسمت کا بھی قلق تھا۔ جو نعمتوں کے ڈھیر اوپر چاچو لگائے رکھتے تھے ان سے نیچے والے ہمیشہ محروم رہے تھے۔ پھر نوشابہ کا بیٹا ہوا۔ فرحت کی بیٹی۔

فرحت کو اپنی قسمت کی خرابی کا یقین ہو چکا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا فرحت کے دل سے بیٹا نہ ہونے کا ملال جاتا گیا تھا۔ جس قدر نیلم باخلاق، نرم، سنجیدہ اور سگھڑ تھی۔ تیمور اتنا ہی لاابالی، غیر ذمہ دار، آوارہ ٹائپ۔ امی اپنی بیٹی کا نوشابہ کے بیٹے سے موازنہ کرتی تو اندر ہی اندر خوش ہو جاتی تھیں۔

"اچھا ہوا۔ میرا تیمور جیسا بیٹا نہیں ہوا۔" وہ اکثر بلند آواز میں نوشابہ کو سناتی تھیں۔ تب بھی نوشابہ نظر انداز کر دیتی تھیں اور کبھی جواب بھی دے دیتیں۔

"اگر تیمور کو آپ کا بیٹا بننا پڑ جائے تو؟" نوشابہ کا قہقہہ نیچے تک سنائی دیتا تھا۔ وہ ہر سنجیدہ بات کو بھی

چٹکیوں میں اڑا دیتی تھیں۔ تب پہلے تو امی کو سمجھ ہی نہ آئی تھی جب سمجھ آئی تو ان کے غصے کا گراف اگلی رات تک بھی اتر کے نہ دیا تھا۔

"نوشابہ کی جرات کیسے ہوئی کیا تیمور جیسا لفنگا میری نیلم کے لیے رہ گیا ہے۔" وہ آگ بگولا ہو کر وکیل صاحب کے سر ہو جاتی تھیں۔

"دنیا میں آخری لڑکا تیمور ہو میں تب بھی نوشابہ کے بیٹے کو اپنا داماد نہ بناؤں۔" اس کی امی کا جلال کئی کئی دن تک قائم دائم رہتا تھا۔ اور تب نیلم خوفزدہ ہو کر کتاب میں منہ گھسا لیتی تھی اور جیسے ہی لفظ پڑھنے کی کوشش کرتی۔ سامنے تیمور کا مسکراتا شوخ چہرہ دکھائی دینے لگتا تھا۔ نیلم اس قدر گھبراتی کہ کتاب الٹ کر لحاف میں منہ دے لیتی تھی۔ لیکن یہاں بھی تیمور ہی...

وہ اٹھ کر لحاف پھینکتی، کچن میں بھاگ جاتی۔ بلاوجہ دھلے ہوئے برتنوں کو دھونے لگتی تھی لیکن یہاں بھی تیمور کا چہرہ، تیمور کی آنکھیں، تیمور کی مسکراہٹ اور نیلم کا دل ہاتھوں سے پھسل پھسل کر لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی کیفیت پہ دنوں انگشت بدنداں رہتی تھی۔

تیمور کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی دوستانہ نہیں رہے تھے۔ پھر بھی اس کی امی کو تیمور پہ شک ہی رہتا تھا۔ وہ کبھی کالج یونی فارم استری کروانے آجاتا تو امی سر پہ کھڑی رہتیں۔ تیمور شرٹ اور پینٹ کا گولا بنا کر اس کے منہ پر دے مارتا اور چیخ کر آواز لگاتا۔

"نیلی، پیلی! جلدی پریس کر دو۔ آج کالج کا منہ دیکھ ہی لوں۔" وہ سیڑھیوں پہ کھڑا ہو کر اوپر سے فائر کھولتا تھا اور امی کچن سے فوراً "برآمد ہو جاتیں۔

"نواب آف کالا باغ! خیریت تو ہے کہیں کالج میں دل تو نہیں اٹکا لیا ورنہ تم اور کالج جاؤ۔ وہ بھی اتنے اہتمام سے۔" امی کی فائرنگ پہ وہ بھی بلا کا منہ پھٹ، منہ توڑ قسم کا جواب دیتا تھا۔

"تیمور کا دل اتنا گرا پڑا نہیں جو خوامخواہ جھاڑیوں میں اٹکتا پھرے۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا حساب برابر کرتا۔ امی بھی مزید معلومات کے لیے کفگیر سمیت باہر نکل آتیں۔ سو در اصل وہ اس کا دل یعنی اندر کا راز لینا چاہتی تھیں کیونکہ آج کل نوشابہ بار بار امی کو سنا رہی تھیں کہ وہ تیمور کی جلدی شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔

"تمہاری ماں تو تمہارے بارہ پاس کرنے کے انتظار میں ہے، ابھی امتحان دو اور ابھی شادی رچا لے۔" امی کا انداز سلگتا ہوا معنی خیز قسم کا ہوتا تھا۔ تیمور آنکھیں میچ کر دیکھتا پھر نفی میں سر ہلانے لگتا۔

"تائی! ایکچوئلی! مجھے کوئی نیلی پیلی تو پسند آ نہیں سکتی۔ میرے لیے تو ممی کو بہت اونچا ہاتھ مارنا پڑے گا۔" وہ بھی کمال کا استاد تھا۔ امی کو باتوں میں ایسے بہلا کر مطمئن کر دیتا۔ یعنی اس دن امی کو اطمینان ہو گیا تھا کہ تیمور خود ہی نیلم کے لیے انکار کر دے گا۔ امی کو چاچو کے سامنے برا نہیں بننا پڑے گا۔ کیونکہ امی اڑتی اڑتی سن رہی تھیں کہ چاچو، ابو سے نیلم کے لیے بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"تو اور کیا۔۔۔ جتنے تم اونچے ہو اتنی اونچی تو وہ بھی ہونی چاہیے۔" امی نے بے ساختہ خوش ہو کر کہا تھا۔ درپردہ وہ کہنا چاہتی تھیں کہ جتنے منہ پھٹ، بدتمیز، آوارہ اور زبان دراز تم ہو۔ اتنی تمہاری بیوی بھی ہونی چاہیے اور وہ بھی تیمور علوی تھا۔ پورا آفت کا پرکالا۔ امی کے اندر تک اتر کے واپس آجاتا۔ ان کے خیالات کو پکڑ لیتا۔ اسی لیے گلا کھنکھار کر گوڑھی سہیلیوں کی طرح بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھتا۔

"ممی کی تو خواہش ہے ان کی بہو کچھ ہو نہ ہو۔ کک ضرور ہو، آپ بتائیں تائی! اپنے داماد میں کیسی خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کا داماد کیسا ہو۔" وہ امی سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوا دزدیدہ نظروں سے نیلم کی طرف بھی دیکھتا تھا۔ جو سر جھکائے پینٹ کی کریز بناتی ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں بے حال ہوتی تھی۔

اس کی رنگت سرخ اور نیلی آنکھیں کچھ اور نیلی ہو جاتی تھیں۔

جبکہ امی بڑے ہی جوش و خروش سے اپنی خواہش تیمور تک پہنچا دیتیں۔

"میں بھی چاہتی ہوں، میرا داماد کچھ ہو نہ ہو۔ یہ مگر ضرور ہو کہ پنشن لینے کے لیے جائیں تو لائن میں



نہ لگنا پڑے۔" امی اس قدر جذب کے ساتھ کہتیں کہ تیمور اپنی ماں کی طرح ہی چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگاتا تھا۔ اور وہیں سیڑھی کی ریلنگ پکڑ کر ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا۔ اور امی اس کے ہنسنے پہ حیران رہ جاتیں۔ پھر انہیں غصہ آجاتا تھا۔ لیکن تیمور کی ہنسی کا سبب تب بالکل سمجھ نہیں آتا تھا۔ اور واقعی ہی نہیں آتا تھا۔ لیکن اگلے آنے والے دنوں میں امی کو تیمور کی اس ہنسی کا سبب معلوم ہو گیا تھا جسے سوچ کر وہ آج بھی طیش سے لال پڑ جاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
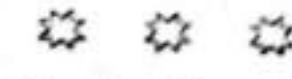
اور یہ بھی سردیوں کے انہی مختصر دنوں کی بات تھی۔

اس دن بڑے انداز میں سورج طلوع ہوا تھا۔ بڑے نرم گرم سے دن تھے۔ لیکن آج کا دن کچھ زیادہ ہی سنہرا اور روشن تھا۔ اس دن کلنگ بھی لمبی اڑان بھر کے نہیں آیا تھا۔ اور نہ ان کی چھت پہ اپنا منحوس شور ڈالا تھا۔ برآمدے کے باہر گلابوں نے اپنی دھوم مچا رکھی تھی جیسے ہی لاؤنج کا دروازہ کھلتا تو ہوا کے زور پہ خوش گوار معطر ہوا کا جھونکا پھسلتا ہوا اندر آجاتا۔ امی چولہے پہ بڑا سا کڑاہا رکھے فلاقند بنا رہی تھیں۔ اور یہ واحد سردیوں کی عیاشی تھی جو نیلم کے نصیب میں آتی۔ سردیوں میں دوپہر کو کھانا نہیں پکایا جاتا تھا۔ بس گرم دودھ کے ساتھ السی کا لڈو، بیسن کی میٹھی ٹکیا یا فلاقند ٹائپ کا کھاجا لیا جاتا تھا۔

لیکن امی نے چاچی کی طرح کبھی بھی کوئی سوغات اوپر بھجوانے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی۔۔۔ نیلم کو یاد نہیں پڑتا تھا امی نے کبھی کوئی چیز اوپر بھجوائی ہو۔ البتہ تیمور زبردستی لڑ جھگڑ کر اپنا حصہ نکلوا لیتا تھا۔ امی لاکھ پردے ڈالتیں، بہانے بناتیں لیکن وہ نکلوا کر ہی دم لیتا تھا۔ اسے ہر اچھی چیز کی خوشبو آجاتی تھی۔

اور امی اس دن فلاقند بنا رہی تھیں۔ یہ کھوئے اور چینی سے بنی بڑی لذیذ مٹھائی ہوتی تھی۔ منہ میں پانی بھر جاتا۔ تیمور کو بہت پسند تھی۔

اور جیسے ہی امی نے آمیزہ ٹھنڈا کر کے "قند" کے ڈلے کاٹنے شروع کیے تھے اسی لمحے تیمور بھی دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا اندر آگیا تھا۔ اسے کھوئے کی مہک کھینچ لائی تھی۔ خوشبو، مٹھاس بھری لذیذ۔

"تائی! اکیلے اکیلے فلاقند کھا کر کیسے ہضم کریں گی، ایک میری ممی ہیں۔ مونگ پھلی کا دانہ بھی ہو تو بھاگی ہوئی نیچے دینے آتی ہیں اور آپ ایسی بے مروت، حد کر دی آپ نے تائی! دل دکھا کر رکھ دیا میرا۔" وہ کھڑ کھڑ بولتا قند کے ایک ساتھ دو ڈلے نگلتا بمشکل امی کو بے مروت سے کنجوس بولنے تک لحاظ کر گیا تھا۔ اور امی جیسے ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئیں۔

"تمہاری ماں تو فریج کا باسی اٹھا کر ہمیں دے جاتی ہے۔" امی کے اس الزام پہ تیمور تڑپ کر ایک اور ڈلہ بھی نگل گیا تھا۔ پھر آنکھیں پھاڑے امی کو دیکھتا رہ گیا۔

"تائی! اتنا بڑا بہتان میں آپ کے خلاف رپٹ درج کروا دوں گا۔ تایا کو وکیل ہائیر کر لوں گا۔ اور آپ کو۔" وہ بولتا ہوا ایک آدھ فلاقند کا قتلہ جیبوں میں اڑستا کھڑا ہو گیا۔ یہ کام اس نے بڑی ہوشیاری سے کیا تھا پھر بھی امی نے دیکھ لیا اور چیخ پڑی تھیں۔

"ارے، کمینے! یہ کیا واپس کرو تم نے اپنا حصہ کھا لیا وہ ٹکڑے اوپر بھجواؤں گی واپس کرو ابھی اسی وقت۔" امی کے چیخنے، دہائی دینے پہ بھی وہ ذرا نہ گھبرایا۔

"اپنا حصہ کھایا ہے نا۔۔۔ یہ تو واپسی کے لیے ہے۔" اس کے کمال اطمینان پہ امی کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ انہیں اختلاج ہونے لگا تھا۔ غصے میں ان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ تیمور کی جیبوں سے قتلوں کو جھپٹ لیتیں۔

"ہم نے تمہارے ناکوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" امی نے غضبناک لہجے میں کہا تھا۔ تیمور مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا۔

"آپ نے کبھی میرے ناکوں کو عید کے عید بھی کوئی چیز نہیں بھجوائی۔ ایک عیدی تک نہیں۔ یہ ٹیسٹ مگر یہ دیکھیں سجا کر اپنی ہی کو رہے تک تک آپ نے

بھولائی ہے۔ دیکھنا، کتنے نمبر بنیں گے آپ کے ماہی بھی خوش ہو جائیں گی۔" وہ اپنا اگلا لائحہ عمل امی کو بتاتا انہیں اور بھی غصہ چڑھا گیا تھا۔

"تمہاری ماہی سے نمبر لگوا کر مجھے ایوارڈ نہیں لینا۔ اب جاؤ، دفعہ ہو۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔" امی نے غصیلے لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا تھا۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"آپ کا دماغ کھا کر کسی نے آپ کی طرح خبطی نہیں ہونا۔" وہ باہر نکلتے ہوئے خاص طور پر نیلم کو سنا کر جانے لگا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔ نیلم گیلری میں فرش پہ کتابیں بکھیرے ٹیسٹ رٹنے میں مصروف تھی۔ تیمور نے دزدیدہ نظروں سے کچن کی طرف دیکھا تھا۔ تائی اس وقت بڑی مصروف تھیں۔ ان کا دھیان باہر نہیں تھا۔ وہ اپنے خزانے کو ٹھکانے لگانے میں مگن تھیں۔

تیمور بالوں میں ہاتھ پھیرتا نیلم کے قریب آرکا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر دو زانو فرش پر بیٹھ گیا۔ نیلم جو آنکھیں بند کیے انگلش کا مضمون رٹ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے کسی کی موجودگی پا کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول لی تھیں۔ کسی کی نظروں کا ارتکاز اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ سا ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں نیلگوں سمندر سی۔ خود بخود جھک سی گئی تھیں۔ کہیں دھڑکنوں میں ہلکا سا ارتعاش رہا تھا۔

وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی کیونکہ تیمور بڑے دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیوں اتنے غور سے اسے دیکھ رہا تھا نیلم سمجھ نہیں پائی تھی۔ بالکل سمجھ نہیں پائی تھی اوپر سے تیمور کی عجیب سی باتیں۔

"تائی کا بی ہیویئر تم نے دیکھا ہے ان کو کس نے نبھانا ہے تایا نے یا میں نے پکڑ کر بے عزتی کر دیتی ہیں۔

اور میں بھی بڑا بد لحاظ ہوں۔ آگے کچھ ہوا نا... تو ذمہ داری تائی کے سر ہو گی۔ سنا تم نے۔" وہ بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نیلم ہونق سی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"تائی خود کو وزیراعظم سمجھتی ہیں۔ اور تمہیں ریاست کی شہزادی سن لو ذرا دھیان سے۔ میں بھی کوئی گرا پڑا نہیں ہوں۔" تیمور کا لہجہ پہلے کی طرح کھردرا اور خفگی سے لبریز تھا۔

"اور ابھی بتا رہا ہوں۔ میرا میٹر بھی الٹا چلتا ہے۔ غور سے میری بات سن لو۔ بعد میں تائی کی ناجائز حمایت کی نا تو بہت برا پیش آؤں گا۔" اس کا انداز کچھ دھمکاتا ہوا تھا۔ نیلم ہکا بکا رہ گئی۔ اسے تیمور کی الٹی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کون سے بعد کی بات کر رہا تھا، نیلم قطعاً نہ جان پائی تھی۔ وہ ذرا بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن تیمور کے پیچھے کھڑی شعلہ بار نظروں سے گھورتی فرحت نے تیمور کی ایک ایک بات سن لی تھی اور پھر ایسا فساد مچا تھا کہ حد نہیں۔ اتنی لڑائی ہوئی کہ بیان سے باہر تھی۔

امی اور تیمور نے طعنوں میں پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔ دونوں سوا سیر تھے۔ کوئی بھی کم نہیں تھا۔ کوئی بھی ہار نہیں رہا تھا۔ پھر تیمور کے بارے میں تو مشہور تھا وہ بہت منہ پھٹ ہے۔ بد لحاظ ہے اور جب وہ امی کی طرح اپنی کرنی پہ آتا تھا تو پھر کسی کی نہیں سنتا تھا۔

اور اس دن تو شاہ بھی گرتی پڑتی سیڑھیاں اتر کر آ گئی تھیں۔ انہوں نے بہت سیز فائر کروانے کی کوشش میں اپنا دماغ کھپایا تھا۔ لیکن نہ امی رک رہی تھیں۔ نہ تیمور باز آ رہا تھا۔ پھر جاتے جاتے وہ امی کو دھمکا بھی گیا۔

"مجھ جیسا آوارہ ہی آپ کے پلے پڑے گا۔ کسی بینکر، انجینئر کے بس خواب دیکھتی رہ جائیں گی۔" وہ امی کی ہر الٹی بات کا الٹا جواب دیتا بھنا تا ہوا باہر نکل گیا تھا، جبکہ امی اگلے ایک گھنٹے تک چیختی رہی تھیں۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی! یہ کمینہ اب میرے پورشن سے گزر کر تو دکھائے۔ میں ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی۔" امی کی دھمکیاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ وہ کمینہ ان کے پورشن تو کیا بیٹی کا بھی مالک و مختار بن گیا تھا۔ لیکن ہوا کیا تھا؟ تب بھلا ہوا کیا تھا۔

"نیلی، او نیلی!" یہ آواز اوپر سے آ رہی تھی اور



پکارنے والا بڑی ڈھٹائی سے پکار رہا تھا۔ نیلم کچن میں بریانی کو دم دے رہی تھی۔ لیکن اس کا سارا دھیان اوپر کی طرف تھا۔ وہ بے بسی سے کبھی اوپر کی پکار پہ دھیان دیتی اور کبھی دزدیدہ نظروں سے تخت پہ بیٹھی فرحت کو دیکھتی۔ فرحت نے اس کی نظروں کا اضطراب دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تخت پہ بیٹھے بیٹھے ہی چمک کر بولیں۔

"اس نواب کی تم نوکر نہیں ہو۔ خبردار، جو باہر نکلیں یا اوپر گئیں۔" ان کے کڑک دار لہجے کی گونج اوپر تک گئی تھی۔ وہ جو تکون میز کے اوپر لگی پلاسٹک پر فارمیکا کی تہہ ہموار کر رہا تھا اور جب میز فٹ ہو گیا تو اس نے اٹھا کر سب سے اوپر سیڑھیوں کے پہلے اسٹیپ پہ رکھ کر پھر سے نیلم کو آواز دی تھی۔

"یہ لو، تایا کا میز فٹ کر دیا ہے۔ مجھے کہہ رہے تھے، کاریگر کو دے آنا۔ میں نے خود ہی ٹھونک دیا ہے۔ اب بتاؤ، نیچے دے جاؤں؟" وہ ریلنگ پہ لٹک کر فرحت کو دیکھتا آنکھ دبا کر نیلم سے مخاطب تھا۔

"اب نیچے آیا تو لوگ ٹانگیں توڑ دیں گے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا تھا۔

"میں کیسے اٹھاؤں گی، وزنی ہو گا۔ تم خود دے جاؤ۔" نیلم کو بالآخر جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"دیکھ لو، میری ٹانگوں کا بیمہ نہیں ہے۔ پہلے گارنٹی دو۔" وہ ریلنگ پر لٹکا اعلان کر رہا تھا۔ نیلم تھوڑا زچ ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا تم میز دے جاؤ۔ ابو کا فون آیا تھا۔ ان کا محرر لے جائے گا۔" نیلم نے کچن میں جا کر برنر بند کیا اور وہیں کھڑے کھڑے سامنے اوپر کی طرف آدھے لٹکے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ اور نیلم کو ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے فرحت کو اشارہ کیا۔

"تائی! آپ کے شوہر کا میز لے کر نیچے آ جاؤں؟"

"پہلے تو تائی کی اجازت سے دندناتے ہو نا۔" فرحت نے جلبلا کر جواب دیا تھا۔ وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"تائی آپ بھی نا سچ مچ بڑی سوئیٹ ہیں۔" تیمور نے مسکہ لگایا تھا۔ پھر نیچے آ کر میز رکھ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو فرحت نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

"زہے نصیب۔" وہ تو واری جانے لگا تھا۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ تیمور!" انہوں نے عینک کے پیچھے سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ تیمور اچھا بھلا چونک گیا۔

"کیسی حرکتیں؟" وہ معصوم بنا۔ پھر سیڑھیوں پہ چڑھ کر دوبارہ پلٹ آیا تھا۔

"یہی صعود و نزول۔" ان کی ناک پہ غصہ آ گیا۔ یہ پھیرے اور اوپر چڑھنا اترنا ان کی برداشت سے باہر تھا۔

"مطلب؟" اسے اچنبھا ہوا۔ وہ واقعی ہی تائی کے طنز کا پس منظر نہیں سمجھا تھا۔

"یہ اتار، چڑھاؤ۔" انہیں اور بھی غصہ آ گیا تھا۔ تیمور کے آنے جانے پہ انہیں شدید قسم کے اعتراضات تھے اور آج تو اس کا رزلٹ بھی آیا تھا۔ خاصا قابل اعتراض قسم کا۔ انہوں نے اسے آڑھے ہاتھوں لیا۔

"کاش کہ چار جماعتیں پڑھ لیتے۔" تائی بھی طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

"تو پھر کیا ہوتا؟ کیا بینک میں افسر لگ جاتا۔" اس نے آنکھیں گھما کر تائی کو بھی گھمانا چاہا تھا۔ یعنی ان کی بات انہی پہ لوٹا دی تھی۔ فرحت کو غصے نے اور بھی گھیرا تھا۔ نیلم نے جیسے سر پیٹ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی اب دوبارہ سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" فرحت نے استہزائیہ کہا۔ ایک تو سوئی میں سے دھاگا نکل گیا تھا اوپر سے اس کی بکواس۔

"تائی! مجھے غصہ مت دلائیں۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"پھر کیا ہو گا؟" تائی فرحت کا استہزا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے فریم کو ایک طرف رکھ دیا۔

"جو ہو گا، اچھا نہیں ہو گا۔" تیمور کو بھی بے تکی ہانکنے کا شوق تھا۔

"جاؤ میاں! اپنا رستہ ناپو۔" فرحت بیزار ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پھر سے فریم اور سوئی دھاگے کو گود میں رکھا۔

"اتنا فارغ نہیں ہوں، جو رستے ناپتا پھروں۔" تیمور کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"تو پھر چوک میں کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی آنکھیں سینکنے کا سبب مل جائے گا۔" فرحت زہرخند لہجے میں بولی تھیں اور بس تیمور کے ضبط کی طنابیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ بولنے پہ آتا تو اس سے بڑا بدلحاظ کوئی نہیں تھا اور اب تو تائی "خالصتاً" ذاتیات پہ اتر آئی تھیں۔ یعنی کہ وہ اسے کیا سمجھتی تھیں "آوارہ، سڑک چھاپ، لچا لفنگا" حد تھی یعنی کہ حد تھی۔

اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر نیلم کا دل دہل گیا تھا۔ اب نجانے کیا ہو جاتا۔

"آپ مجھے سمجھتی کیا ہیں؟" وہ جارحانہ انداز میں چیخ پڑا تھا۔ فرحت نے بے نیازی سے نیا ٹانکا چڑھالیا۔ جیسے تیمور کے غصے کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔

"اپنے آپ سے پوچھ لو۔" ان کی بے نیازی کا عالم وہی تھا۔

"اپنا آپ تو مجھے بڑا خوب صورت لگتا ہے۔" معاً نیلم کے زرد کپکپاتے چہرے پہ تیمور کی نگاہ پڑی تو اس نے اپنا انداز، لہجہ اور الفاظ تک بدل لیے تھے۔ وہ غصے کو دبا کر سابقہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولنے لگا تھا۔ یوں کہ بس گھڑی بھر کی دیر میں نیلم کے چہرے کی زردی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتری نمی تک سوکھ گئی۔ چہرے پہ ہلکا سا اطمینان پھیل گیا تھا۔ جو تیمور کو اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ وہ تائی سے مزید جھگڑنا چھوڑ کر الٹے قدموں سیڑھیاں چڑھتا اوپر غائب ہو گیا تھا۔

اور یہ تو بس گھڑی بھر کی بات تھی۔ پرانی عادتیں چھوٹتے ہی چھوٹتی ہیں۔ نہ امی، تیمور، چاچی اور چاچو کے لیے رام ہوئی تھیں اور نہ تیمور جواب دینے سے باز آتا تھا۔ نہ انہیں غصہ دلانے سے باز آتا تھا۔

اس دن نوشابہ چاچی نیچے آئیں تو امی کو بہانہ مل گیا ان سے تیمور کو ٹھکانے لگانے والے موضوع پہ گفتگو کرنے کا کیونکہ چاچی خود ایمس سالہ تیمور کو بیاہنے کے لیے بے تاب بیٹھی تھیں۔ بس ان کو شوق تھا۔ جوانی میں ساس اور دادی وغیرہ بننے کا۔ یہ تو اس دن چاچی نے امی کو بتایا تھا وہ تیمور کی کیوں جلدی شادی کرنا چاہتی ہیں۔

"تیمور اور نیلم کے بعد ہمارے گھر کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اس گھر کی دیواریں ترس گئی ہیں بچوں کی آوازیں سننے کے لیے، میری بھابھی بھی وقاص کے لیے لڑکی ڈھونڈ چکی ہیں۔ آگے پیچھے ان کی شادیاں ہو جائیں گی۔" نوشابہ چاچی نے بڑی خوشی اور حسرت بھرے لہجے میں بتایا تھا تب فرحت زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

"تم تو بس میکے والوں کی ریس میں بھاگتی رہنا۔" چاچی کے چہرے پہ پھیلی الوہی سی مسکراہٹ کو نظر انداز کرکے فرحت کو اچانک خیال آیا تھا گو کہ خیال تو اچانک نہیں آیا تھا۔ لیکن انہوں نے انداز ایسا ہی اپنایا کہ یوں لگے اچانک خیال آیا ہو۔

"تم نے تیمور کے لیے لڑکی نہیں دیکھی؟"

"لو بھابھی! لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔" نوشابہ نے عادتاً" قہقہہ لگایا تھا۔ فرحت کو اچنبھا سا ہوا۔

"تو کسی بھیڑ بکری سے شادی کرو گی؟"

"اور سن لو جی... حد کرتی ہیں آپ۔ اپنے گھر میں بچی موجود ہے تو باہر کیوں تلاشوں؟" نوشابہ نے جیسے فرحت کی عقل پہ ماتم کیا تھا اور فرحت کو یوں لگا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ اچھل کر ایک فٹ دور جا بیٹھیں اور نوشابہ کو یوں گھورنے لگی تھیں جیسے نوشابہ کا دماغ چل گیا ہو۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟" ایک خدشے کے تحت انہوں نے بات صاف کرلینا ضروری سمجھا تھا۔ فرحت کے انداز کو نظرانداز کرکے فرش پہ پوچا لگاتی نیلم کو میٹھی نگاہ سے دیکھتی نوشابہ نے بڑے پیار سے کہا۔

"اپنی نیلی ہے نا۔ پھر کسی اور کا کیا کروں۔ میرا تو بس نیلی پہ دل ہے۔" نوشابہ کی ملائمت بھری آواز کو فرحت کی ترشی نے لمحوں میں مسمار کردیا تھا۔ وہ بھونچکی سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"دیکھو بی بی! آج میں تمہیں کلیئر کردوں تاکہ تم لوگ کوئی امید مت رکھو۔ تیمور اس قابل نہیں جو میرا داماد بنے۔ نہ شکل نہ ہنر نہ تعلیم۔ نیلی ابھی بچی ہے بمشکل سولہ کی بھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو پڑھے لکھے گی۔ پھر اس کی کسی انجینئر، بینکر سے شادی کروں گی۔ اگر تیمور بھی کسی قابل ہوتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔ ابھی تک باپ کی کمائی کھا رہا ہے۔ کل کو بیوی بچوں کو کہاں سے کھلائے گا "کیا باپ کے سامنے ہتھیلی پھیلا کر۔" فرحت نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوشابہ کا منہ بند کروا دیا تھا اور نوشابہ اپنا دھواں دھواں چہرہ لیے الٹے قدموں اوپر گئیں تو پھر نیچے اتری ہی نا۔

ان کا دل اس توہین اور غم سے پھٹا جارہا تھا۔ کیا ان کے بیٹے میں اتنے بڑے سقم تھے جو گھر کی بچی کا رشتہ ملنا بھی محال تھا۔ اور انکار بھی اتنی بے دردی کے ساتھ "ابھی تو وہ باقاعدہ رشتہ لے کر نہیں آئے تھے۔ اگر بھابھی کو منظور نہیں تھا تو سبھاؤ سے انکار کردیتیں۔ اس طرح توہین کرنے کی کیا ضرورت تھی "اتنا ذلیل کرنے کی کیا ضرورت تھی ان کے اکلوتے بیٹے میں کمی کیا تھی جو اس طرح سے ذلیل کرکے انکار کردیا گیا۔ سوچنے کے لیے لمحہ بھی نہیں لگایا۔ نوشابہ کا کمزور دل اس صدمے کو برداشت نہ کرسکا اور انہیں انجائنا اٹیک ہوگیا نوشابہ ہسپتال کیا گئیں گھر میں زلزلہ آگیا۔ تیمور، فرحت کے ساتھ اس قدر لڑا کہ حد نہیں۔ وقاص زبردستی اسے کھینچ گھسیٹ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"تائی نے میری ماں کو ہسپتال پہنچایا ہے۔ یہی میری ماں کی مجرم ہیں۔" تیمور کی بازگشت نیلم کو پہروں رلاتی تھی اور وہ تکیے میں سر گھسا کر روتی رہتی۔

ان دونوں آشیانہ غمگین پہ سوگوار فضا کا سایہ تھا۔ ابو پریشان تھے اور چاچو ابو سے بھی زیادہ پریشان تھے۔ ابھی چاچی ٹھیک ہو کر گھر بھی نہیں آئی تھیں کہ چاچو کا اچانک بلڈ پریشر ہائی ہوا اور انہیں بھی اٹیک ہو گیا۔ تیمور ان دنوں گھن چکر بنا ہوا تھا۔ گھر، ہسپتال کے درمیان بھاگ بھاگ کر اسے اپنا کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اس کے ماموں کی فیملی اسے برابر سپورٹ کرتی تھی۔ وقاص کی بیوی سبرین ہی ان کا کچن سنبھالتی اور گھر کی دیکھ بھال کرتی۔ چاچو اور چاچی دونوں بستر سے لگ گئے تھے۔

اسی دوران چاچو کی نہایت شکستہ حالت دیکھ کر وکیل صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسا فیصلہ کرلیا تھا جس میں فرحت کی ذرا سی مرضی شامل نہیں تھی۔ انہوں نے آخری دم تک مخالفت کی تھی آخر تک ضد کی تھی۔ گھر چھوڑ دینے کی دھمکی تک دی، لیکن وہی ہوا تھا جو تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ ان کی ہر ضد، ہر مخالفت، ہر غصے، ہر لڑائی کی قیمت تیمور اور نیلم کے نکاح اور رخصتی کی صورت چکانی پڑی تھی۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ فرحت کا دماغ تک ہل گیا۔ وہ دم بخود ہو چکی تھیں۔ ساکت اور گم صم ہو چکی تھیں اور کئی دنوں تک ان پہ یہی کیفیت طاری رہی تھی۔

اور نیلم اپنی کتابیں تخت پہ بکھری چھوڑ کر نیچے سے اوپر شفٹ ہو گئی تھی۔

جس قدر اچانک نکاح اور پھر رخصتی ہوئی تھی، ولیمہ چاچو نے بہت شاندار کیا تھا۔ اور ولیمے سے پہلے دونوں پورشن رنگ و روغن کے بعد سجا ڈالے تھے۔

اچھے بھلے بیمار چاچو اور چاچی تیمور کی شادی کے جوش اور خوشی میں بھلے چنگے ہو گئے تھے۔ گو کہ اندرونی طور پر وہ بیمار ہی تھے لیکن ظاہر یہی کرتے کہ وہ ٹھیک اور تندرست ہیں۔ وہ ہشاش بشاش رہ کر بس تیمور کو خوش کیا کرتے تھے جو اپنے والدین کے لیے اتنا حساس ہو چکا تھا کہ ان کی ذرا سی بے ترتیب سانسیں اس کی اپنی سانسوں کو بے ترتیب کردیتی تھیں۔

ولیمے والی رات تیمور بڑا خوش تھا اور تب تک نیلم بھی اچانک ہونے والے نکاح اور رخصتی کے جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ اس رات تیمور بہت ہنس رہا

تھا۔ اور ہنستا ہنستا بستر پر گر گیا۔ اس کی ہنسی نیلم کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ویسے بھی نیلم کی اتنی سمجھ ہی نہیں تھی۔ وہ اتنی نادان، معصوم اور بھولی تھی کہ اسے کوئی جس سمت لگاتا وہ چپ چاپ لگ جاتی تھی اور ابھی بھی تیمور کے ہنسنے پہ مارے گھبراہٹ کے وہ خود بھی ہنسنے لگی۔

اور پھر جب تیمور کی ہنسی کو بریک لگے تب نیلم نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

"تم کیوں ہنس رہے تھے اتنا؟" اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھا اور ڈھیر ساری معصومیت بھی اور تیمور نیلی نیلی ان آنکھوں کی معصومیت میں جیسے گوڈے گوڈے ڈوب گیا تھا۔

"پہلے تم بتاؤ۔ تم کیوں ہنسی تھی؟" تیمور نے کہنی کے بل سر کو اونچا کر کے نیلم کے سندر روپ کو آنکھوں کے ذریعے اندر اتارا تھا۔ اور ایسے ہی یوں ہی سی اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

"میں تو تمہیں دیکھ کر۔" نیلم نے معصومیت سے کہا تھا۔ تیمور جیسے اس ادا پہ لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

"اور تم۔۔۔" نیلم نے سوال کیا تھا۔ شاید وہ بھی یہی جواب دیتا۔ لیکن اس کا جواب اسی کی طرح بہت مختلف تھا۔

"میں تو تائی کو دیکھ کر۔" اور پھر تیمور نے بتانا شروع کر دیا۔

"ہوٹل میں تائی سے کسی نے پوچھا۔۔۔ آپ کا داماد کیا کرتا ہے؟ تو تائی نے پتا ہے کیا جواب دیا۔" اس نے آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت بھر کے نیلم کی طرف دیکھا اور بولا، جبکہ نیلم بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

"تائی نے کہا۔ اپنے باپ کے پیسوں پہ عیش کرتا ہے۔" اور پھر تیمور کو ڈھیر ساری ہنسی نے آن گھیرا۔ تائی کے تاثرات اسے اب بھی مزہ دے رہے تھے۔

"بے چاری ایسے ولیمے میں شریک تھیں جیسے کوئی زبردستی باندھ کر لایا ہو اور واقعی ہی تایا ان کو دھمکیاں دے کر ساتھ لائے تھے۔"

نیلم اس کی ہنسی پہ ذرا خفا ہو گئی تھی۔ لیکن تیمور اپنی جون میں لگا ہوا تھا۔

"تائی بے چاری کا ایک خواب تو ٹوٹ گیا۔ مجھے اس پہ بڑا افسوس ہے۔ صبح انہیں ضرور پرسہ دوں گا۔" وہ بڑے شرارتی انداز میں بول رہا تھا۔ اور تصور کی آنکھ سے تائی کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر وہ بڑا شاد نظر آ رہا تھا۔

"کون سا؟" نیلم نے سادگی سے پوچھ لیا تھا۔ پھر پوچھ کر جیسے پچھتائی تھی۔

"وہ بینکر داماد والا۔۔۔ کیا خبر، زندگی کے کسی موڑ پہ تائی کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔" تیمور نے اچانک ایک عجیب بات کہہ دی تھی۔ اس قدر عجیب کہ نیلم تک بھونچکی رہ گئی گو کہ اسے سمجھنے میں وقت لگا تھا لیکن پھر بھی۔

"بھلا کیسے؟" نیلم کو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ جانتی بھی تھی تیمور کو بے سوچے بولنے کی عادت ہے۔ لیکن اس کے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ اور اب کیا ہو سکتا تھا۔

"کیا خبر میں مر جاؤں یا پھر ہماری سپریشن ہو جائے۔" وہ بہت صاف گو تھا لیکن اس قدر سفاک بھی ہو گا؟ نیلم کو اندازہ تک نہیں تھا۔ جب بات نیلم کی سمجھ میں آئی تو وہ اس قدر شدت سے روئی تھی کہ تیمور حواس باختہ ہو گیا۔ پھر آدھی رات تائی تائے میں اور آدھی رات نیلم کے آنسو پونچھنے میں گزر گئی تھی۔ صبح تک تیمور کا سر گھوم رہا تھا۔

"یہ تائی کی بیٹی بھی نا تائی سے کم نہیں، بھیجہ اڑا کر رکھ دیا۔" وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ پھر بے خبر سوئی نیلم کے سرہانے تک آیا۔ اس کے چہرے پہ آوارہ لٹیں بکھر رہی تھیں۔ تیمور نے اس کے بال ہٹائے تو وہ کسمسا کر اٹھ گئی تھی۔ آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے بکھرے بالوں کو کیچر میں سمیٹا تھا۔

پھر تیمور کو دیکھ کر اچانک اچھل پڑی تھی۔

"میں یہاں کیسے؟" گویا وہ کچھ دیر کے لیے اپنی پچویشن بھول گئی تھی۔ تب تیمور نے اسے بڑے انداز



میں یاد دلایا۔

"آپ آج سے نہیں۔۔۔ کافی دنوں سے یہاں ہیں۔"

"میں نے سمجھا کوئی خواب نہ ہو۔" نیلم جھینپ کر مسکرا دی تھی۔ تیمور کو اسے ستانے کے لیے ہتھیار مل گیا تھا۔

"گویا تم مجھے خوابوں میں بھی سوچتی رہی ہو؟" تیمور پیچھے پڑ گیا تھا۔ جواب لیے بغیر جان کیسے چھوڑتا۔ آخر نیلم کو بتانا ہی پڑا تھا۔

"ہاں۔۔۔ میرے خوابوں میں تمہارا آنا جانا تو تھا ہی۔" اس کے لبوں پہ الوہی سی مسکان پھیل گئی تھی، جسے کمال محبت سے چنتا وہ سرشار ہو گیا تھا۔ کیونکہ جو اس کے دل میں نیلم کے لیے جذبات تھے۔ نیلم بھی ویسے نرم گرم جذبات رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور شادی ہو جانے سے زندگی کا اختتام نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اصل زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ اور ساتھ ذمہ داریوں کی بھی۔ نیلم سے زیادہ جلدی تیمور نے شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کو سمجھ لیا تھا۔ وہ خاصا مدبر ہو گیا۔ اور نوشابہ فخر کا مرقع بنی ہر ایک کو بتاتی تھیں کہ میں نہ کہتی تھی۔ شادی کے بعد تیمور سدھر جائے گا۔ اور واقعی ہی تیمور کچھ نہ کچھ سدھر گیا تھا۔ گو کہ اس میں لاابالی پن جوں کا توں تھا لیکن بہت ساری چیزوں میں وہ سنجیدہ اور خاصا سمجھ دار ہو گیا تھا۔ جن میں سرفہرست اپنے ممی پاپا کو دوائیاں کھلاتا۔۔۔ انہیں زبردستی واک پہ لے جاتا۔ انہیں ہسپتالوں کے چکر لگوانے مختلف لیبارٹیز سے ٹیسٹ کروانے۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے بے انتہا حساس ہو گیا تھا۔

جب وہ بیمار ہوئے تو اسے پتا چلا تھا۔ ماں باپ کتنا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور اس کا قریبی رشتہ بھی وہی ہیں۔ ان کے بعد وہ کس قدر اکیلا ہو جائے گا۔

اور یہی بات نوشابہ کو پریشان کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں، ان کی زندگی میں تیمور کی شادی ہو جائے۔ وہ اپنے گھر بار کا ہو جائے۔ ورنہ بعد میں تیمور کا کیا بنتا ان کا اکلوتا نادان بیٹا کہاں دھکے کھاتا۔

نوشابہ کی سوچ ایک ماں والی سوچ تھی۔ اور انہوں نے جیسے تیسے ہی سہی اپنی سوچ اور خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا تھا گو کہ فرحت کے بے بہا طعنے بھی سننے کو ملتے تھے۔ وہ انہیں جلی کٹی سناتی تھیں۔

"بس بیماری کا بہانہ تھا۔ مجھے نیچا دکھانے کے لیے ڈرامہ رچایا۔ اور اب بھلی چنگی ہو گئی۔" فرحت آتے جاتے طنز کے تیر پھینکتی تھیں۔ تب نوشابہ پھر سے پہلے کی طرح ہنستی رہتیں۔

"اگر بیماری کا ڈرامہ نہ کرتی تو نیلی میری زندگی کو روشن کرنے کیسے آتی؟" وہ محبت پاش نظروں سے نیلی کو دیکھتی تھیں اور نیلم بے ساختہ جھینپ جاتی۔ اس کی شرم اور جھجک ابھی تک قائم و دائم تھی۔ لاکھ کوشش سے بھی نہ جاتی۔

"اور یہی لوگوں کی مکاریاں ہیں۔ جو ہمیں نہ آئیں۔" فرحت کچوکے لگانے سے باز نہ آتی تھیں۔

"یہ محبت ہے بھابھی!" نوشابہ بحث پہ آجاتی تھیں آخر کس بیٹے کی ماں تھیں۔

"دیکھ لی محبت ہم نے تو۔" ان کا لہجہ زہر آلود ہو جاتا۔

"ہم نے کون سی نفرت کا مظاہرہ کیا۔" نوشابہ پریشان ہو جاتی تھیں۔

"جو پشت میں خنجر چلایا یہ کم تھا کیا؟" فرحت کے پرانے غم جاتے ہی نہ تھے۔ نوشابہ بھونچکی رہ گئیں۔ پھر بمشکل بول پائی تھیں۔

"میں سمجھی نہیں۔" اور واقعی ہی نوشابہ سمجھ نہیں سکی تھیں۔ وہ بڑی حیران نظروں سے فرحت کو دیکھتی رہیں۔ جو بیٹی کو ان کے گھر بیاہ کر بھی دل سے کدورتیں نکال نہیں پائی تھیں۔

"تم کیوں سمجھو گی۔ بہت بھولی ہو تم۔" فرحت کے تیور بگڑ گئے تھے۔ اور ان کی آواز بھی علوتا" بلند ہو گئی تھی۔ اوپر لاؤنج میں تیمور ٹی وی دیکھتا پاپ کارن کھا رہا تھا۔ آوازوں کو بلند ہوتا دیکھ کر ریلنگ سے لٹک کر نیچے دیکھنے لگا۔ نوشابہ اور فرحت لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور دونوں کے موڈ خاصے خراب تھے بلکہ خطرناک حد تک خراب لگ رہے تھے۔ تیمور کے چہرے پہ ناگواری پھیل گئی تھی۔

"آپ کھل کر بات کریں۔" نوشابہ کی دھیمی آواز ابھری تھی۔ تیمور بھی رک گیا تھا۔ دراصل وہ فرحت کی آواز سننا چاہتا تھا اور ان کے الفاظ۔

"کیا کھل کر بات کروں؟ کیا تمہاری بیٹی ہوتی۔ کوکھ کی جنی تو تم کسی ویلے نکمے سے بیاہ سکتی تھی؟ بتاؤ ذرا۔"

فرحت کے آگ میں لپٹے الفاظ سن کر تیمور کو ایک ایک بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اور جیسے جیسے وہ سمجھتا گیا اس کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا تھا۔ مارے توہین اور غصے کے اس کی رنگت تانبے کی طرح تپ گئی تھی۔ اور اسے یوں لگا تھا جیسے وہ کھڑے قد سے گر گیا ہے۔

"تم نے جذباتی ڈرامہ رچا کر میرے شوہر کو ورغلایا اور میری بیٹی کا زبردستی نکاح اپنے بیٹے سے کروالیا۔"

اب وہ بھاں بھاں کر کے رو رہی تھیں۔ تیمور کا دماغ سنگ اٹھا۔ اسے اپنی ماں کی فکر پڑ گئی۔ تائی کے الفاظ سن کر وہ پہلے کی طرح بیمار نہ ہو جائیں؟ پھر ہسپتال نہ پہنچ جائیں، وہ کون سا پہلے تندرست تھیں۔ اپنے بیٹے اور بہو کی خاطر بمشکل جی رہی تھیں اور یہی حالت پاپا کی بھی تھی۔

جیسے ہی وہ تن فن کرتا نیچے اترا نوشابہ بیٹے کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئیں۔ اب ان دونوں کا جھگڑا پکا تھا۔ ایک اینٹ تھا تو دوسرا پتھر تھا۔ دونوں میں نرمی اور جھکاؤ نہیں تھا۔ نوشابہ کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔ بڑی مشکل کے ساتھ منتیں ترلے کر کے وہ تیمور کو اوپر لے جانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ لیکن تیمور کا غصہ کسی قیمت نہیں جاتا تھا۔ وہ جب تک سنانہ لیتا۔ اپنی بھڑاس نہ نکال لیتا۔ اسے چین نہیں آسکتا تھا۔

لیکن پہلے ممی اور پھر نیلم کے لیے اسے چپ ہونا پڑا تھا۔ کیونکہ اسی شام نیلم کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اسے ارجنٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو یہ خوب صورت انکشاف ہوا۔ نیلم امید سے تھی اور یہ خبر ایسی راحت جاں قسم کی تھی، جس نے تیمور کے سارے غصے کو بھلا دیا تھا۔ وہ چیختا چلاتا آشیانہ تقلین میں داخل ہوا تھا۔

"تائی، تائی!" وہ انہیں تلاشتا کچن تک پہنچ گیا۔ پھر ہانڈی بھونتی فرحت کو بے ساختہ گھما ڈالا تھا۔

"ارے لڑکے! باؤلے ہو چکے تم۔" تائی گھومتی ہوئی بیزاری اور خفگی سے چلائی تھیں۔ تیمور انہیں مسلسل گھماتا رہا۔

"رکو تو۔ کیا کرتے ہو؟ دماغ گھما دیا میرا۔" وہ پھر سے چلائی تھیں۔

"آپ کا دماغ آل ریڈی گھوما گھمایا ہے۔ مزید گھمانے کی ضرورت نہیں۔" تیمور ابھی تک انہیں چکر دے رہا تھا پھر اچانک ہی رک گیا۔ تائی بے چاری سر تھام کر اسٹول پہ ڈھے گئی تھیں۔ بڑی دیر بعد انہوں نے سنبھل کر تیمور کو دیکھا تھا پھر اسے وہ کھری کھری سنائیں کہ حد نہیں۔ ان کا دل ابھی تک قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے تمہارا۔" وہ چیخی تھیں۔

"کیا مل گیا تمہیں، جو اس قدر باؤلے ہو رہے ہو تیمور؟"

"ملا نہیں، ملنے والا ہے۔" تیمور چلایا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" فرحت چونکی تھیں۔ پھر تیمور کے پیچھے شرمائی شرمائی نیلم کو دیکھ کر سمجھ گئیں۔ نیلم جلدی سے ماں کے گلے سے آلگی تھی۔

"وہ امی بتانا ہے کیا؟" نیلم ہکلا کر کچھ بولنا ہی چاہتی تھی جب تیمور نے اسے ٹوک دیا۔

"رہنے دو، تم تو پندرہ منٹ خوامخواہ ضائع کر دو گی۔ میں بتاتا ہوں۔ تائی! کچھ بتایا ہے یا نہیں بتایا۔ آپ کو



نانی ضرور بنا دیا ہے۔ آپ کی ایک اور عہدے پہ پروموشن ہونے والی ہے۔" تیمور کے سارے انداز ہی جدا تھے۔ ہر بات کا الگ طریقہ تھا۔ اب بھی تائی کو شاک کی کیفیت میں چھوڑ کر اوپر نیلم کا ہاتھ پکڑ کر چلا گیا تھا۔ اور وہ جیسے حق دق دیکھتی رہ گئی تھیں۔

بھلا یہ عمر تھی نیلم کی ماں بننے والی وہ تو ابھی خود بچی اور ناسمجھ تھی۔ وہ کیسے سب کچھ سنبھال سکے گی، ایک ماں ہونے کے ناطے ان کی سوچ درست تھی لیکن طریقہ غلط تھا۔

اس معاملے پہ بھی وہ تیمور کو معاف کرنے پہ تیار نہیں تھیں۔۔۔ جانے کتنی مرتبہ وہ طعنے دے چکی تھیں۔

"ناک پونچھنے کی خبر نہیں۔۔۔ کمانے کی فکر نہیں۔۔۔ ابا بننے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔"

اور پھر تائی کی لاکھ رکاوٹوں، غصے اور تلخی، طعنوں کے باوجود شادی کے دسویں مہینے تک جینا ان کی زندگی میں آچکی تھی اور جینا کے فوراً" بعد بیلا بھی۔ لیکن بیلا کی آمد سے پہلے ہی ان کی زندگیوں میں کئی طرح کے بھونچال آگئے تھے۔ چاچو کی جاب ختم ہو گئی تھی۔ سرکاری نوکری تو تھی نہیں۔ جو پنشن کا آسرا ہوتا۔

ان دنوں تیمور بھی سخت پریشان تھا۔ لیکن ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اوپر سے تائی کے لامحدود طعنے۔

ایک دن جینا کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے نیلم نے تیمور کو کہہ ہی دیا۔

"تم امی کو کچھ بن کر دکھا ہی دو۔"

"باپ بن کر تو دکھا دیا ہے۔ اب اور وہ کیا چاہتی ہیں مجھ سے۔" تیمور اندر کی پریشانی چھپا کر ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔ لیکن تیمور کی یہ خوش مزاجی بھی بس چار دن کی مہمان تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگیوں میں سے ہنسی کی جھنکار نکلنے لگی تھی۔

چاچو کی جاب کے ساتھ ہی سارے ٹھاٹ باٹ قائم تھے۔ جاب جاتے ہی سب عیاشیاں خیال ہونے لگی تھیں۔ اوپر سے ایک بچی کی ذمہ داری بھی۔۔۔ چاچی چاچو کی مہنگی مہنگی دوائیں۔ علاج معالجہ گھر کے اخراجات تیمور دنوں میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے اور جمع جتھا کچھ تھا ہی نہیں، تائی کے کہے الفاظ جیسے درست ہو گئے تھے اور پھر ان کے طعنوں کا بھی کوئی انت نہیں تھا۔

تنگ آکر تیمور نے نیلم سے وہ زیورات مانگ لیے تھے جو چاچی نے اسے دیے تھے اور وہ بہت قیمتی زیورات تھے جو نیلم نے اپنی ماں کے پاس رکھوائے تھے۔ لیکن جیسے ہی تائی کو بھنک پڑی۔ تیمور کی نظر زیورات پہ ہے، انہوں نے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ چاچو کا پائی پائی پاس ہوتا تھا جو بہت ضروری تھا۔ گھر کے اخراجات بھی لامحدود تھے۔ اوپر سے مہنگائی کا بھوت۔ تیمور نے کبھی روپے کی تنگی نہیں دیکھی تھی۔ اب ان حالات کو دیکھ کر وہ گھبرا رہا تھا۔ نیلم سب سمجھتی تھی۔ امی کو بہت دفعہ مجبور بھی کیا۔ لیکن وہ مان کے نہیں دے رہی تھیں۔

"یہی تو بچت ہے تمہاری۔۔۔ کل کو بچی بیاہو گی تو اسے ڈال دینا۔ یہ تیمور بھی ماں کی طرح کھا اڑا دے گا۔" ان کی اپنی منطق تھی۔ جو کسی اور وقت ہوتی تو شاید درست تھی۔ لیکن اب تو جیسے فرحت کا انکار وبال بن گیا تھا۔

حالات میں پستا تیمور ان دنوں ویسے ہی پارہ صفت بنا ہوا تھا۔ نیلم نے زیورات سے ہاتھ کھینچا تھا تو تیمور کا بلا سبب ہی ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ پھر جو طوفان اٹھا وہ الگ تھا۔ فرحت نے بات اتنی بڑھا لی کہ ختم ہی نہ ہوئی۔

نیلم روٹھ کر نیچے شفٹ ہو گئی تھی بلکہ زبردستی فرحت اسے نیچے لے آئی تھیں۔

چاچو اور چاچی نے اسے واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔ لیکن فرحت کی بھی ایک ہی ضد تھی۔

"تیمور خود آئے، معافی مانگے اور نیلم کو لے جائے۔" تیمور نے سنا تو صاف جواب دے دیا تھا۔

"جیسے گئی ہے ویسے خود ہی آئے۔"

یوں انا اور ضد کی عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ فرحت اسے جانے نہیں دیتی تھیں اور تیمور اسے لینے نہیں آتا تھا۔ ان دنوں نیلم کی طبیعت بھی سخت بیزار تھی۔ بیٹا کی آمد آمد تھی اور حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ تیمور بھی جب ضد پہ آجاتا تو ہٹتا نہیں تھا۔ پھر فرحت کے سارے طعنے اوپر ضرور پہنچتے تھے۔

"اسی لیے تو میں تیمور کو رشتہ نہیں دیتی تھی۔ نکما، وٹلا۔۔۔ نہ تعلیم نہ ہنر۔۔۔ ساری عمر بیٹی اور اس کے بچوں کو پالتے رہنا۔" وہ سناتی وکیل صاحب کو تھیں لیکن آواز با آسانی اوپر پہنچتی تھی اور تیمور جانتا تھا یہ سارے الفاظ اس کے لیے کہے جاتے ہیں۔ تب وہ ریلنگ سے لٹک کر کسی شیر کی طرح غراتا تھا۔

"جب کچھ بن جاؤں گا۔ آپ کی مہارانی کے قابل ہو جاؤں گا تو پھر اسے بھیج دینا۔"

"تم جیسے ساری عمر باتیں بناتے ہیں۔ کام دھام نہیں کرتے۔ پہلے تو باپ کے روپے نے عیب چھپا رکھے تھے۔ اب سارے ستم اندھوں کو بھی نظر آتے ہیں۔ ماں نے ساری عمر عیاشی میں روپیہ لٹایا۔ اب آخری عمر رلتی رہے۔ جب بیٹا بھی زمانے بھر کا نکما ہے۔" فرحت برتن اٹھا اٹھا کر پٹختی تھیں۔ اپنی ساری فرسٹریشن بول بول کر نکال لیتی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں۔ سننے والوں پہ ان کے الفاظ کس کیفیت میں اپنا اثر ڈالتے تھے۔

تیمور جب جب سنتا۔ اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ اتنی توہین اس قدر تذلیل۔۔۔؟

بندوں پہ اچھے برے وقت آتے ہی رہتے ہیں لیکن کوئی کسی کو اس حد تک ذلیل نہیں کرتا ہو گا۔ جس قدر تیمور دن رات ذلت اٹھاتا تھا۔ صبح اٹھتا تو نیچے سے آوازیں آنا شروع ہوتی تھیں۔ پھر رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

فرحت کے ذہن میں ایک پختہ خیال تھا کہ تیمور کچھ نہیں کر سکتا۔ اب ان کے برے دن شروع تھے اور ہمیشہ برے ہی رہنے تھے۔ کیونکہ ثقلین کے پاس سیونگ کے نام پہ دھیلا بھی نہیں تھا۔ پنشن کا سہارا بھی نہیں تھا۔ اور تیمور بھی اس قابل نہیں کہ کچھ کر سکتا؟

لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ اتنا حیران کن، تکلیف دہ اور پر اذیت۔۔۔ سوچا جاتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج بھی نیلم خیال کرتی تو اسے یقین نہیں آتا تھا۔۔۔ بالکل یقین نہیں آتا تھا۔ کیا تیمور ایسا کر سکتا تھا؟ کیا تیمور اس طرح سے کر سکتا تھا۔

نیلم سوچتی تو خود کو تپتے صحراؤں میں پاتی۔ جلتی بھٹی میں سلگتی، دن رات تڑپتی۔۔۔ لیکن چین کہیں نہیں تھا۔

اور جب خیال تیمور کی طرف پرواز کرتا، اس کے دھوکے، بے وفائی کو یاد کرتا تو نیلم کو ایسا تاپ چڑھتا کہ دنوں ہوش نہیں رہتا تھا۔ یوں لگتا، وجود کسی توے کے شکنجے میں بھل بھل جل رہا ہے۔ کسی بھٹی میں سلگ رہا ہے۔ کسی پھوڑے میں سڑ رہا ہے اور اس کے جسم سے گلے ہوئے ماس اور چربی کی بساند اٹھ رہی ہے۔۔۔ وہ خود کو اتنا ہی ناکارہ اور بے کار سمجھتی تھی جسے تیمور دھتکار کر چلا گیا تھا۔

اور تیمور کے چلے جانے، اسے چھوڑ دینے اور قطع تعلقی کرنے کے بعد نیلم اک طویل مدت تک خود کو اسی کے حصار میں پاتی تھی۔ جس مقام پر، جس موڑ پہ، جس استھان پہ تیمور اسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی بھون پہ سرنیہوڑائے اس کی راہوں پہ نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ تاوقتیکہ اس کی زندگی میں کوئی اور آ گیا۔

آیا یا زبردستی داخل ہوا؟ بات تو ایک ہی تھی۔ نیلم اپنی ماں کے مجبور کرنے پہ یا حالات کی سختیوں سے تنگ آکر اگر اپنے استھان سے ہٹ گئی تھی تو یہ ہٹنا ہی قیامت تھا۔

اور یہ ہٹنا کوئی معمولی نہیں تھا۔ اسے آگ کا دریا پار کرنا تھا۔ اسے پل صراط پہ چلنا تھا۔ اسے آبلہ پائی کا سفر کرنا تھا۔ سب سے بڑی بات اپنے سچے دل کو تیمور کی یادوں سے خالی کرنا تھا اور یہ بہت کٹھن امر تھا۔ یہ بڑی دشوار راہ تھی۔ یہ اذیت ناک مرحلے تھے۔

لیکن نیلم بے بس کر دی گئی تھی۔ فرحت نے اسے بہت مجبور کر کے اس دوراہے پہ کھڑا کیا تھا۔ اپنے لیے نہیں، نیلم کے لیے نہیں۔۔۔ اس کی دونوں بیٹیوں کے لیے۔۔۔ فرحت چاہتی تھیں نیلم ان کی زندگی میں ہی اپنی بے کنارہ زندگی کو کنارہ دے لے۔ ورنہ جانے بعد میں حالات کیسے ہوں ان کی جوان بیٹی اور دونوں نواسیوں کو تحفظ کی ضرورت تھی اور یہ تحفظ ایک مرد دے سکتا تھا۔ بہت مجبور کرنے، منتوں، التجاؤں کے بعد انہوں نے نیلم کو بالآخر خرم کے لیے راضی کر لیا تھا۔

لیکن اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا کہ وہ اپنے ہرجائی شوہر کو بھول جائے۔ جس نے اتنے سالوں میں کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ جانے وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا فرحت نے ایک عالم سے مسئلہ بھی پوچھ لیا تھا۔ اور وہ بالا ہی بالا سارے معاملات نمٹا رہی تھیں وہ جلد از جلد نیلم کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

اور ادھر نیلم یادوں کے تپتے نخلستان سے نکل نہیں پاتی تھی۔ ہر وہ بری، تکلیف دہ اور بھیانک یاد جو بھٹکا بھٹکا کر بھی تیمور کی طرف لے جاتی تھی۔

اور تیمور کے دیے بے وفائی کے گھاؤ، وہ بنا بتائے خنجر چلا دیتا۔ وہ زندہ سلامت درگور کر دیتا کسی کنویں میں دھکا دے دیتا۔

نیلم کو آج بھی وہ دن یاد تھے۔ جب رات رات بھر تیمور گھر نہیں آتا تھا۔ اور وہ آنکھیں نچلے پورشن کی کھڑکیوں سے چپکا کر اس کی راہ تکا کرتی تھی۔ لیکن وہ ان دنوں گھر آتا ہی نہیں تھا۔ جانے کہاں رہتا، جانے کیا کرتا اور پھر نیلم کے صرف پندرہ دن نیچے قیام کے دوران ہی آتا "فاتا" تیمور کے باہر چلے جانے کی خبریں اڑنے لگی تھیں۔ اس کے قریبی دوستوں میں سے کسی نے فرحت کو اطلاع دی تھی کہ تیمور نے اپنے کسی کنیڈین دوست کی بیوہ بہن سے شادی کر لی ہے۔ اس کے دوست کی بہن بھی نیشنلٹی ہولڈر تھی۔ یوں دنوں میں ہی تیمور باہر چلا گیا اور صرف باہر نہیں گیا تھا۔ ان کی زندگیوں سے بھی چلا گیا تھا۔ بغیر ملے بغیر بتائے۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹی کو بھی دیکھے بنا، تیمور کے چلے جانے کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی نوشابہ اور ثقلین بھی کنیڈا چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے فرحت، نیلم اور اپنی پوتی سے ملنا چاہا تھا شاید لیکن فرحت نے انہیں منہ توڑ جواب دے دیا۔

جب ان کا بیٹا سارے تعلق ختم کر گیا تھا تو وہ مزید کیوں پچھلے رشتوں کو بحال رکھتیں، "آشیانہ" ثقلین ان کے چلے جانے سے ایک دم خالی اور ویران ہو گیا تھا۔ ایسا ویران کہ پھر ہمیشہ ویران ہی رہا۔ پھر کئی موسم آتے اور جاتے رہے تھے۔ رُت بدلتے رہے، لمحے گزرتے رہے۔۔۔ دن ہفتے مہینے، سال دبے پاؤں کھسکتے رہے۔ جانے والے نہ آئے تھے نہ انہوں نے کوئی رابطہ کیا تھا۔ جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔

نہ کوئی خط نہ کوئی فون اور نہ ہی کسی کے ہاتھ کبھی کوئی پیغام آیا تھا۔

نقوی صاحب کے وفات کا شروع میں نوشابہ اور ثقلین سے رابطہ تھا جو بعد میں ختم ہو گیا تھا۔

بس نیلم اتنا جانتی تھی کہ تیمور نے اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں میں گم ہو کر انہیں بھول چکا تھا۔ اسے کبھی یاد بھی نہیں آیا ہو گا کہ وہ اپنے پیچھے کسے چھوڑ آیا تھا۔ کتنی آنکھوں کو روتا چھوڑ آیا تھا۔ کتنے دلوں کو تڑپتا چھوڑ آیا تھا۔ اور پھر نیلم نے ایک لمبا، کٹھن اور پر اذیت سفر طے کیا تھا۔ لیکن تب وہ ایک اور نیلم کا روپ دھار چکی تھی۔ اس نے خود کو مضبوط کیا تھا۔ اپنے لیے نہیں، اپنی بچیوں کے لیے۔ اپنے ارادوں کو مستحکم کیا تھا۔ اپنے دل کو پائیدار کیا تھا۔ اور ایک ہرجائی کی ہر یاد سے خالی کیا تھا۔ اس کے بعد وقت اتنا تلخ اور مشکل نہیں رہا تھا۔

اس نے فرحت کے بہت مجبور کرنے، احساس دلانے اور ان کی ہزار منتوں کے بعد اپنی تعلیم کو مکمل کیا تھا۔ جانے کب، کیسے، کس طرح جینا بیلا کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ نیلم کا ایم بی اے بھی ہو

گیا تھا اور اسے مقامی بینک میں جاب بھی مل گئی۔
گھر کے حالات پہلے سے کچھ ابتر تھے۔ کیونکہ پہلے وہ ایک کمانے والی کافی قناعت پسند تھی۔ لیکن اس کی بیٹیاں ذرا بھی صبر اور قناعت نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی فرمائشوں کے سلسلے دن بدن بڑھتے جارہے تھے۔
اور تب فرحت بے بس ہو کر لڑنے بیٹھ جاتی تھیں۔ نیلم کی تنخواہ اچھی تھی۔ لگ بھگ پچاس ہزار کے قریب۔ لیکن بچیاں اس کی خواہش کے مطابق مہنگے ترین اسکول میں پڑھتی تھیں۔ پھر وین کا کرایہ ہی آٹھ ہزار تھا۔ ماہانہ فیس، ٹیوشن فیس اور بقایا اخراجات نکال کر اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں بچتی تھی۔ اور جینا بیلا جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھیں۔ ان کی خواہشات کا گراف بھی بڑھتا جارہا تھا۔ جو کچھ وہ اپنے اردگرد دیکھتی تھیں۔ ویسا خود بھی چاہتی تھیں، انہیں ہر چیز وقاص کی بیٹی سحا جیسی چاہیے تھی، اور وہ اپنی خواہشوں کو دل میں رکھنا نہیں جانتی تھیں۔ بس یہاں پہ نیلم پوری طرح بے بس ہو جاتی تھی۔
پچھلے دنوں سے وہ اپنے باپ کے لیے سوال کر کر کے فرحت کا بھی دماغ کھا رہی تھیں اور نیلم کا بھی۔۔۔ تنگ آکر فرحت نے کہہ دیا۔ "تمہارا باپ مر چکا ہے۔" اور فرحت نے شاید غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کم از کم ان کے لیے تو باپ مرا ہوا ہی تھا۔ جو انہیں دھتکار کر چلا گیا۔ لاوارث پھینک کر چلا گیا۔ جس نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔ وہی مرا ہوا باپ اچانک قبر سے اٹھ کر زندہ ہو گیا تھا۔
اور نیلم تب سے لے کر اب تک بڑی متوحش، متفکر اور بدحواس تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے جھلتی دوپہر میں چکر کھاتے ہوئے بڑی بے بسی سے جینا بیلا کے بند کمرے کو دیکھا تھا۔ وہ کل سے نیلم سے ناراض تھیں۔ اور ابھی تک مانی نہیں تھیں۔ بچیاں ناراض ہو تیں تو اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ کچھ بھی تھا دونوں بچیوں میں اس کی جان تھی۔

اس کا ذہن بہت الجھ رہا تھا۔ وہ شدید پریشانی میں مبتلا تھی۔ آئندہ آنے والے حالات کو کس طرح مینیج کرے گی۔ اپنے تئیں بڑے حوصلے، صبر اور ضبط کے ساتھ پل صراط سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کے لیے ایک فیصلہ کیا تھا۔ جس پہ امی ابو بھی راضی تھے۔ اور پھر بچیوں کو بھی کسی حد تک ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا۔ وہ بھی شاید ذہنی طور پر تیار تھیں۔ بس ایک مرحلہ تھا جس سے نپٹ کر نیلم کی زندگی کو کنارہ مل جاتا۔ پہلے تو شاید خلع کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ تھا ہی لاپتا لیکن اب فرحت کی خواہش تھی۔ سیدھا سیدھا کورٹ سے خلع لے لی جاتی۔ کیونکہ کسی بھی صورت تعلقات کی بحالی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جو نفرتوں کی خلیج ان کے درمیان پہلے سے قائم تھی وہ بڑھتی ہوئی اور بھی دوریوں کا سبب بن چکی تھی۔ اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ کیونکہ نوشابہ، ثقلین اور تیمور "آشیانہ ثقلین" میں باقاعدہ طور پر شفٹ ہو چکے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ایک نیا محاذ کھلنے والا تھا۔ فرحت آگ بگولا تھیں۔ انہوں نے اندرونی سیڑھیوں والا دروازہ بھی لاک کر لیا تھا۔ تاکہ وہ باہر سے گزرتے رہیں۔ اس طرف ان کا تعلق ختم تھا۔ اور بچیوں پہ بھی باہر نکلنے میں سخت پابندی تھی۔
اور وہ ان دنوں گھر کے اندر محصور تھیں اور انتہائی ڈسٹرب بھی۔ جبکہ فرحت ابھی بھی اس کے پاس آدھا گھنٹہ بیٹھ کر اگلے معاملات جلدی سے نمٹانے پہ زور دے کر گئی تھیں۔
کچھ دیر پہلے انہوں نے کوئی دسویں مرتبہ اپنی بات دہرائی تھی۔
"خرم سے کہو اپنی ماں کو بھیجے۔ کیونکہ ہمارا کیس تو پہلی تاریخ پہ ختم ہو جائے گا۔"
"وہ تو ابھی نکاح کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ جو دیر ہے ادھر سے ہے۔" نیلم کنپٹیاں دبا کر بتا رہی تھی۔
"تم نے بات کر لی؟" فرحت کو نجانے کیا پریشانی تھی۔
"ہاں جی ہو گئی۔" نیلم دھیمی آواز میں بولی۔



"تم نے بچیوں کے بارے میں فائنل بات کر لی؟" ان کا انداز بڑا مضطرب قسم کا تھا۔ وہ چاہتی تھیں بس ایک ہفتے کے اندر اندر نیلم اس گھر سے چلی جائے۔ وہ اوپر والوں کا سایہ بھی دوبارہ ان پہ ڈالنا نہیں چاہتی تھیں۔
"خرم کو کوئی اعتراض نہیں۔" نیلم ابھی اور بھی انہیں مطمئن کرنا چاہتی تھی لیکن خرم کی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ نیلم کے لبوں پہ ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا تھا۔
"بے وفا لوگو! کہاں تھے!" خرم مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔
"آپ کے خیالوں میں ہی تھے۔" نیلم بھی شگفتگی سے بولی تھی۔ خرم جیسے بے ہوش ہوتے ہوتے گرنے لگا تھا۔
"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ اس کی شوخیوں پہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔
"ابھی تمہارا ہی ذکر خیر چل رہا تھا۔"
"اچھے الفاظ میں یا برے الفاظ میں؟" خرم نے شرارتاً پوچھا۔ جب سے نیلم نے باقاعدہ ہاں کر کے مژدہ جاں فزا سنایا تھا تب سے خرم کی چونچالی عروج پہ تھی۔
"ظاہر ہے، اچھے الفاظ میں۔" نیلم نے خفیف انداز میں کہا۔ تب خرم مصنوعی لہجے میں اکڑتا ہوا بولا تھا۔
"بس جی، کبھی غرور نہیں کیا۔" وہ بڑے خوشگوار لہجے میں مسکرا رہا تھا۔
"اچھا اب کام کی بات پہ آجاؤ۔" نیلم نے اس کی شوخیوں کو طویل ہوتے دیکھ کر روکنا چاہا تھا۔ وہ بھی قدرے سنجیدہ ہو گیا۔
"جو حکم؟" وہ اپنے ازلی خالص تابعدارانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ نیلم اس کے انداز پہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ خرم آئندہ زندگی میں بھی اس کے لیے کوئی بڑی پرابلم نہیں بنے گا۔ اس میں لچک تھی۔ اس کے رویے میں لچک تھی۔ وہ جلدی بات سمجھ بھی لیتا تھا اور مان بھی جاتا تھا۔ یہ اس کی اچھی عادتوں میں ایک عادت تھی کہ وہ زیادہ بحث میں بھی نہیں پڑتا تھا۔ اور ہر نفع و نقصان کو ایک طرف رکھ کے جس بات پہ قائم ہو جاتا پھر ہٹتا نہیں تھا۔ نیلم لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر اس نے امی کی خواہش خرم تک ایک مرتبہ پھر پہنچادی تھی۔
خرم سن کر قدرے خفا ہو گیا تھا۔
"کیا میری بات پہ آنٹی کو اعتبار نہیں۔۔۔ جینا اور بیلا صرف تمہاری نہیں بلکہ اب وہ میری بھی بیٹیاں ہیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہوں۔۔۔ اور وہ پہلے ہیں تم بعد میں ہو۔" اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں نیلم کی تسلی کرادی تھی۔ گو کہ خرم پہ اسے پورا بھروسہ تھا پھر بھی ایک ماں ہونے کے ناطے اس کو کئی طرح کے خدشات لاحق تھے۔
"خرم وہ دونوں میرے ساتھ ہی رہیں گی۔" نیلم نے ایک مرتبہ پھر واضح لہجے میں بتایا۔
"تم سے الگ وہ کیسے رہ سکتی ہیں، ظاہری بات ہے وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔ تم بتاؤ معاملہ کہاں تک پہنچا؟" خرم نے بہت سنجیدگی سے بولتے ہوئے اگلا لائحہ عمل پوچھا تھا۔ تب نیلم بھی سنجیدہ سی فرحت کا پروگرام اس کے گوش گزار کرنے لگی۔
"بس کورٹ کا تھوڑا سا پروسیجر ہے۔"
"وہ تو تمہارے ابو کر لیں گے۔" خرم مطمئن تھا۔
"اور پہلی تاریخ پہ ہی معاملہ ختم ہو جائے گا۔"
"ہوں۔" نیلم کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ وہ کنپٹیاں دباتی ہوئی سیدھی ہوئی تھی۔ جینا اور بیلا کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ نیلم کچھ چونکنا ہو گئی تھی۔ یہ دونوں کہاں نکل رہی تھیں۔
"اور تم بھی اوپر والوں سے محتاط رہنا۔" خرم اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔
"اور بچیوں کو بھی اوپر مت جانے دینا۔"
"یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سو ایک

سے دو مرتبہ ڈسوانے والا عقل مند نہیں ہوتا۔ تیمور کیسے سوچ سکتا ہے؟ جیسا سب کچھ وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ پیچھے سب کچھ ویسا ہی ہو گا۔" نیلم کا لہجہ زہر خند ہو گیا تھا۔ خرم نے نرمی اور ملائمت سے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بھول جاؤ اس بے غیرت ہرجائی کو میں تمہاری زندگی سے ہر دکھ مٹا دوں گا۔ کبھی تم پہ آنچ آنے نہیں دوں گا۔" خرم کا انداز بہت مستحکم تھا۔ وہ اس کے لہجے کی سچائی میں کھو سی گئی تھی اور یہی لمحہ بھر کی چوک تھی۔ جینا بیلا چپکے سے کھسک کر باہر نکل گئی تھیں۔ نیلم اپنے ہی دکھوں میں مشغول رہی۔ وہ دونوں گھر میں ہونے والی چہل پہل اور اوپر سے آتی آوازوں کا پیچھا کرتی 'مارے تجسس کے ماربل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی تھیں۔

اور پھر ان کی نیلی آنکھوں میں تحیر پھیلتا چلا گیا تھا۔

وہاں وائٹ ٹراؤزر اور ریڈ ٹی شرٹ میں موبائل کو کان سے لگائے سوما کے انکل کسی سے لڑائی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھا اور بالکل انہی کی طرح شاکڈ رہ گئے۔

اور پھر دوسرے ہی پل انکل نے چیخ چیخ کر ممی ممی پکارا تھا۔ دوسرے ہی پل گوری چٹی سی ممی افتاں خیزاں چلی آئیں۔ پہلے تو وہ انکل کی طرح متحیر ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ اپنے بیٹے کی طرح چیخ ماری تھی۔

"جینو' بیلو۔۔۔" انہوں نے دونوں بانہیں پھیلا لی تھیں یوں کہ جینا بیلا نے پہلے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا تھا پھر لمحہ بھر کی دیر میں کسی میکانکی قوت کے تحت خواب آگیں انداز میں چلتی ہوئی ممی کی کھلی بانہوں میں سما گئیں۔ اور جیسے سالوں کے فاصلے لمحوں میں مٹ گئے تھے۔ انہوں نے ممتا اور محبت کی عجیب سی ٹھنڈک محسوس کی اور شاکڈ سی رہ گئی تھیں۔ کیونکہ انکل بھی گھٹنوں کے بل ان دونوں بہنوں کے پاس بیٹھے بڑی معصومیت اور لجاجت سے بانہیں پھیلا کر کہہ رہے تھے۔

"ادھر کانٹے نہیں اگے ہوئے۔ کیا مجھے نہیں ملو گی۔" تیمور نے ہلکی سی سرگوشی نما آواز میں کہا تھا۔ پھر ان دونوں کے ملائم ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیوں سے باری باری چوم لیے۔

"انکل!" وہ اس کے قریب آئی تھیں۔ تیمور نے دونوں کے گلابی پھولے پھولے گالوں کو نرمی سے چھوا اور بولا۔

"اوں ہوں۔۔۔ آئی ایم ناٹ یور انکل۔۔۔ پلیز کال می ڈیڈی' آئی ایم یور فادر۔۔۔ کال می ڈیڈی۔۔۔ بولو شاباش' کورس میں بولو۔۔۔" اس نے باری باری دونوں کے لمبے بکھرے بالوں کو سہلایا تھا۔ ان دونوں کی نیلی آنکھوں میں تحیر اُمڈا' پھیلا اور بہنے لگا تھا۔ سوما کے انکل کیا کہہ رہے تھے۔ سوما کے انکل کیا پاگل تھے۔ ان کے ڈیڈی تو مر چکے تھے اور نئے ڈیڈی آنے والے تھے۔۔۔ وہی نیلی کے کولیگ اور اب یہ بھی ڈیڈی نکل آئے؟ کہاں سے؟ بالکل اچانک۔۔۔ کیا اللہ تعالیٰ نے واپس بھیج دیا؟

اور انہوں نے کسی خواب آگیں لہجے میں تیمور کی تقلید میں' اس کے بار بار مجبور کرنے پہ کورس میں گا کر سنایا اور کہا۔

"ڈیڈی۔" ان کی زبان سے ایک نغمہ سا گنگناتا ہوا پھسل پڑا تھا۔ تیمور اور اس کی ممی نے بے ساختہ خوشی اور جوش کے عالم میں ان دونوں کو پھر سے اپنے گرم سینوں میں سمو لیا۔

"ویٹس ویری گڈ۔۔۔ یو آر ویری پریٹی گرلز۔" اس نے دونوں کے ماتھے باری باری چومے تھے۔ پھر ان کی نیلی گہری لمبی آنکھوں میں پھیلتی حیرانی کو ختم کرتے ہوئے بولا تھا۔

"یو بوتھ آر مائی ڈاٹرز۔۔۔"

☼ ☼ ☼

یہ ایک لوہے کا اونچا بڑا سا ڈرم تھا۔ جس کے نیچے چار ٹانگیں نہیں۔ دو ٹانگیں موجود تھیں۔ جس طرف وزن زیادہ ہوتا وہ ڈرم اس طرف سے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ اور جیسے ہی ڈرم لڑکھڑاتا جینا بیلا کی چیخیں دل دہلا دیتی تھیں اور اونچی آواز میں چلاتی اور شور مچاتی تھیں۔

"ہمیں نیچے اتاریں۔" ان کی آوازوں میں خوف 'آنسو اور ڈر کی آمیزش تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ سے یہ شور اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ نیچے سے آتی کربناک چیخیں اس کا بلڈ پریشر ہائی کر رہی تھیں۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ پھر وہ باہر کی طرف جانے کی بجائے اندرونی دروازے تک آیا۔ مکین اس سے پوچھ رہے تھے۔

نیچے کیا ہو رہا ہے؟ اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے!

تیمور نے اشارے سے بتایا اور ہتھوڑا ڈھونڈ کر لے آیا۔ پھر اس نے سیڑھیوں کے دروازے پہ پہلی زوردار ضرب لگائی تھی۔ نیچے سے آتی آوازیں کچھ دب سی گئی تھیں۔

فرحت نے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا تھا۔ پھر دونوں بچیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جن کے آنسو خوف کے مارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور رنگت لٹھے کی مانند سفید تھی۔ قریب ہی نیلم تخت پر سر جھکائے بیٹھی آنسو پینے میں مصروف تھی۔ کیونکہ جینا بیلا کی چیخوں اور رونے کو برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

نیلم نے کبھی ان دونوں کو پھولوں کی چھڑی سے نہیں مارا تھا۔ کبھی بہت خوفناک حد تک غصہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ اور امی تک سے اس معاملے پہ ناراض ہو جاتی تھی کہ وہ جینا بیلا کو ہر وقت ڈانٹا نہ کریں۔ وہ دونوں بہت چھوٹی ہیں اور حساس بھی۔

لیکن اس وقت وہ امی کو بھی روکنے سے قاصر تھی۔ کیونکہ ان دونوں سے غلطی بھی تو بہت بڑی سرزد ہوئی تھی۔ کیا ضرورت تھی ان کے منع کرنے' روکنے ٹوکنے کے باوجود اوپر جانے کی؟ اور اگر چلی ہی گئی تھیں تو یہ بڑے بڑے چاکلیٹ کے ڈبے' کوکیز' کینڈیز کے پیکٹ اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ سارے پیکٹ فرش پہ گرے اپنی بے قدری پہ نوحہ کناں تھے۔ جبکہ جینا بیلا کو فرحت نے سزا کے طور پر ڈرم کے اوپر کھڑا رکھا تھا۔ اور نیلم جانتی تھی آج ان کا لنچ بھی بند ہو گا۔

اوپر سے ہتھوڑے کی ضربیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں اور ساتھ جینا بیلا کی چیخیں۔

"قسم کھاؤ 'اب جاؤ گی اوپر؟ ان منحوسوں سے ملو گی؟ ان کی دی گئی خیرات اٹھا کر لاؤ گی۔" فرحت نے کفگیر کی ڈنڈی سے ان دونوں کی پھیلی ہتھیلیوں پہ ایک ایک ضرب لگائی تھی۔ وہ دونوں پرائمری اسکول کے بچوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر کھڑی تھیں اور فرحت کسی جلاد ٹائپ استانی کی طرح کفگیر کو چھڑی بنا کر ان کی ہتھیلیوں پہ نشان ڈال رہی تھیں۔ ہر ضرب جیسے نیلم کے دل پہ پڑ رہی تھی۔ اور وہ ضبط کرتے کرتے عاجز ہو گئی۔ اس نے آنکھیں رگڑ کر بمشکل پھٹی پھٹی آواز میں کہا تھا۔

"اب بس بھی کریں امی! غلطی ہو گئی ان سے۔" فرحت نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹی کو دیکھا تھا۔

"اسی لیے سمجھا رہی ہوں کہ دوبارہ غلطی نہ کریں۔"

"اب نہیں کریں گی۔" نیلم نے جیسے منت کی تھی۔

"یہ کیوں اوپر گئی ہیں؟ یہ کیوں ہمارے دشمنوں سے ملی ہیں۔" فرحت کے تیور غضبناک تھے۔ ابھی تک ان کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔

معاً" ہتھوڑے کی ضربیں لگنا بند ہو گئی تھیں۔ دروازہ اچانک کلک کی آواز سے کھلا تھا۔ پھر خوفناک سی چرچراہٹ کے بعد دونوں پٹ وا ہو گئے تھے۔ اور پھر وقت جیسے گھومتا ہوا گیارہ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہی تیمور کے اتار چڑھاؤ۔ وہی ریلنگ سے لٹک کر فرحت سے لڑنا۔ اوپر سے فائرنگ کرنی۔ گولے گرانے۔ دوبدو جواب دینے۔ ایک کی دس سنانی اور کبھی بھی لاجواب نہ ہونا۔ بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ فاتحانہ نظروں سے دیکھنا اور دھپ دھپ کرکے سیڑھیوں پہ چڑھ جانا۔

یوں لگا جیسے گزرا ہوا وقت گھومتا پھرتا واپس آگیا تھا۔ وہی تیمور تھا۔ وہی اس کی تائی۔۔۔ وہی تخت کے قریب کھڑی پہلے کی طرح ہی گم صم نیلم۔ وہی تائی کا جلال اور وہی تیمور کا جارحانہ انداز۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ بدلا ہو۔ سب کچھ جوں کا توں ہو۔ لیکن سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ کچھ کردار پہلے سے زیادہ تھے۔ ذرا پرے کھڑی بھل بھل روتی دونوں لڑکیاں ایک واضح اور روشن حقیقت۔۔۔ ایک اٹل دلیل ایک مستحکم جواز۔۔۔ جو اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

اور وقت جیسے لمحہ بھر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ رک گیا تھا۔ تھم گیا تھا۔

نیلم کی سرخ نیلی نگاہیں اٹھی تھیں پھر جیسے جم کر رہ گئیں۔ وہ سامنے سے جارحانہ تیور لیے سیڑھیاں اترتا نیچے آرہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ریلنگ سے لٹک کر فائر کھولنے کی بجائے نیچے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

کاٹن کا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنے، آنکھوں میں ڈھیروں غصہ۔۔۔ سرخ رنگت۔۔۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہینڈسم ہو گیا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو بہت دبلا پتلا تھا۔ بہت سوکھا، لمبا تڑنگا لیکن اب اس کا جسم بھر گیا تھا۔ چہرے پہ آزاد صحت مند فضاؤں اور خوشحالی کی چمک دمک تھی۔ نیلم کو اندر ہی اندر جیسے حسد سا ہوا۔

"اور ہمیں روگ لگا کر کیسی ہری بھری ہے دنیا۔۔۔ ہمیں تو سرتاپا جلا دیا۔" اس کے اندر زہر کی پھوار پڑنے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔

معاً" تیمور کی سلگتی، سرد اور برفیلی آواز نیلم کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر تیمور کو دیکھنے لگی۔ وہ نیلم کی بجائے فرحت سے مخاطب تھا۔

"آپ میری بچیوں کو کس خوشی میں ہراساں کر رہی ہیں تائی۔۔۔ ان کا جرم کیا ہے۔" اس کی آنکھوں سے سلگتے شعلے نکل رہے تھے یوں کہ فرحت کا دماغ ہی الٹ گیا تھا۔

"تمہاری بچیاں یہ تمہاری کہاں سے ہو گئیں دس سال بعد تمہیں لگا کہ یہ تمہاری بچیاں ہیں۔" فرحت کی تیوری چڑھ گئی تھی۔ غصے کی شدت سے ان کا میٹر گھوم رہا تھا۔

"دس سال پہلے بھی یہ میری بیٹیاں تھیں اور دس سال بعد بھی میری بیٹیاں رہیں گی۔ آپ نے نیلی کے ساتھ انہیں جہیز میں نہیں بھیجا تھا۔" اس نے کمال اطمینان سے فرحت کے چھکے چھڑاتے ہوئے دونوں کو باری باری ڈرم سے اتارا تھا۔ پھر فرش سے تمام بکھرے پیکٹس اٹھا کر زبردستی بچیوں کو پکڑائے۔ نوشابہ ریلنگ سے جھانک رہی تھیں۔ اس نے ممی کو اشارہ کیا۔ وہ نیچے آگئیں تو۔ تیمور نے دونوں بچیوں کے ہاتھ انہیں پکڑا کر کہا۔

"آپ کچھ دیر کے لیے انہیں اوپر لے جائیں۔ میرے لیپ ٹاپ پہ کارٹون لگا دیں۔ میں بھی ان سے دو دو ہاتھ کر کے آتا ہوں۔" اس نے بچیوں کو منظر سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ جینا بیلا کے سامنے وہ کوئی بھی بات نہ کھولنا چاہتا تھا نہ کرنا چاہتا تھا۔

"انہیں کیوں بھیج دیا ہے۔ روکتے یہاں، اپنے نام نہاد باپ کے کرتوت سن کر جاتیں۔ ایسا باپ جو اچانک آسمان سے گرا یا زمین سے اگا۔" فرحت نے نفرت انگیز لہجے میں کہا تھا۔ تیمور نے آرام سے ان کی بات سن لی تھی۔

"آپ اپنے ہر قول و فعل میں سچی ہیں۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے ابھی کے ابھی آپ اور آپ کی بیٹی کے سارے طبق روشن کرتا جاؤں۔۔۔ لیکن میں کوئی بھی وضاحت آپ کو نہیں دوں گا۔ ہاں، اگر نیلم پوچھے تو یہ اس کا حق ہے۔"

"نیلم تمہیں کیوں منہ لگائے گی؟" تائی حلق تک چلائی تھیں۔ تیمور اتنے کشیدہ ماحول میں اچانک مسکرا دیا تھا۔ ایک تو یہ تائی بھی، نا۔۔۔ بندے کو غصے پہ قائم نہیں رہنے دیتی تھیں۔ ایسی بات ضرور کر دیتی تھیں جو خوامخواہ سارے غصے کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیتی۔ حد تھی بھئی۔ نیلم کیوں منہ لگائے گی، وہ جیسے ان کی بات پہ بے طرح لطف اندوز ہوا تھا۔ جیسے اس نے بڑا انجوائے کیا تھا۔

"نیلم کو مجھے منہ لگانا ہی پڑے گا۔ آپ کو پتا تو ہے میں کس قدر مستقل مزاج ہوں۔ جس کام کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جاتا ہوں۔ اسے تکمیل تک پہنچا کے دم لیتا ہوں۔" تیمور نے بڑے اطمینان سے انہیں ماضی یاد دلایا تھا۔ جب وہ تیمور کو رشتہ نہیں دینا چاہتی تھیں اور اتنے بڑے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔ لیکن ہوا کیا تھا وہ جیسے مسکرا دیا۔

"بھول ہے تمہاری۔ صرف ایک ہفتہ نکل جانے دو۔ تمہاری ساری خوش فہمیاں ہوا ہو جائیں گی۔" فرحت نے تنفر سے سر جھٹک کر کہا۔

"رہنے دیں تائی! آپ کے سارے بوگس دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ نہ اتنی لمبی لمبی چھوڑا کریں۔ جو آپ چاہ رہی ہیں۔ وہ کبھی نہیں ہو گا کم از کم میری زندگی میں تو نہیں ہو گا۔" تیمور نے بالوں میں بے نیازی سے ہاتھ پھیرے تھے۔ فرحت اور نیلم جیسی چونک گئی تھیں۔ تیمور کو کیسے بھنک پڑ گئی؟ اسے خرم کے رشتے کا کیسے پتا چلا گیا وقاص نے بتایا ہے یا پھر دونوں ماں بیٹی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"آپ کی گڈ لک تائی! بالآخر بینکر داماد آپ کو ملنے ہی والا ہے۔ لیکن لگتا نہیں آپ کی خواہش پوری ہو گی۔ کیونکہ بیچ میں ابھی "ہم" موجود ہیں۔ اب یا تو آپ میرے لاپتہ ہونے کی دعا کریں یا مرنے کی، اس سے پہلے تو آپ کی خواہش پوری نہیں ہو گی۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھرے بہت پہلے والا تیمور لگ رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا، پھلجڑیاں چھوڑتا۔۔۔ یوں لگا، جیسے بیچ میں دس سال آئے ہی نہ ہوں۔ نیلم ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا گنگناتا ہوا جان بوجھ کر نیلم کے قریب سے گزر کر اوپر جا رہا تھا اور جاتے سمے جو اس نے الفاظ کہے تھے۔ وہ بھی امی کے سامنے۔ اس کا مارے اشتعال توہین اور خفت سے منہ سرخ ہو گیا تھا۔

وہ نیلم کے ٹکر ٹکر دیکھنے پہ ذرا بلند آواز میں بولا۔

"تمہاری اپنی ہی چیز ہوں۔ ڈنکے کی چوٹ پہ دیکھ لو اور اگر دل نہ بھرے تو اوپر آ کے دیکھ لو۔ اپنی اماں جان سے نظر بچا کر۔ میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہو۔" اس کا انداز انتہائی بے شرمانہ تھا۔ کینیڈا جا کر تو وہ کچھ اور بے حیا ہو گیا تھا۔ نیلم مارے شرم اور اشتعال کے اپنے آپ میں کٹ کر رہ گئی تھی۔

اور پھر تیمور کی خودسریوں کا یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ بلکہ اگلے آنے والے دنوں میں اس نے فرحت اور نیلم کو ناک کے بانسے تک عاجز کر دیا تھا۔ ہوا کچھ یوں۔

☼ ☼ ☼
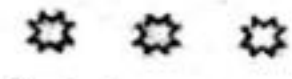
سویرا ہوتے ہی سورج شعلے اگلنے لگا تھا۔ ایسی قیامت خیز گرمی تھی کہ حد نہیں اور ابھی تو صبح کا وقت تھا۔ دوپہر اور سہ پہر میں نجانے کیا ہوتا۔

باہر چبھتی گرمی جسم کو جھلسا رہی تھی۔ سیماں صحن میں جھاڑو لگا کر اوپر چلی گئی تھی۔ جب سے اوپر والا پورشن آباد ہوا تھا سیماں کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس نے بھی آنکھیں بدلنے کے ساتھ پارٹی بھی بدل لی تھی۔ اوپر ایسی آسامی تھی۔ جن کا مینیو ہی بڑا ہائی فائی ہوتا تھا۔ جبکہ نیچے بھوک اور افلاس ناچتی تھی۔ ہر روز کچن میں دال، سبزی، آلو پکے ہوتے۔ سیماں تک ناک بھوں چڑھانے لگی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی یہاں سے کچھ نہ ملا تو اوپر سے دگنا مل جائے گا۔ اور وہ بھی ایسی ایسی قسم کا جو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا نہ کھایا تھا۔

آج بھی اسکول سے آ کر جینا بیلا نے تخت پر بیگ پھینکے تھے اور بھوک بھوک چلاتی کچن میں آ گئی تھیں۔ نیلم کا بھی ہاف ڈے تھا۔ آج وہ بھی ٹائم سے گھر آ چکی تھی۔ پھر اس نے آلو کے کباب اور پودینے کی چٹنی گھوٹ لی تھی۔ ساتھ سلاد اور پھلکے تھے۔

اس نے میز لگا کر ان دونوں سے کہا۔

"آ بھی جاؤ کھانا کھا لو۔۔۔" وہ کچن سے آواز لگا رہی تھی۔ بیلا نے آلو کے کباب دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تو جینا نے بڑی بے مروتی سے پلیٹ اٹھا کر پرے کھسکا

دی تھی۔ دونوں کے منہ سوجے اور پھولے ہوئے تھے۔ نیلم جیسے سمجھ گئی۔ یعنی آج بھی کھانا پسند نہیں آیا تھا۔

"کبھی تو اچھا والا کھانا پکا لیا کریں۔" بیلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"اتنی بھوک لگی ہوئی تھی اور آج پھر آلو۔ ہر روز آلو۔ کبھی آلو میتھی، کبھی آلو پالک، کبھی آلو بینگن، کبھی آلو شملہ۔ ہماری لائف میں اتنے آلو کیوں ہیں؟" ٹھنکتی ہوئی یہ آوازیں اوپر تک بھی جا رہی تھیں اوپر جہاں لاؤنج تک میں فل ایئرکنڈیشنڈ چل رہا تھا۔ ایل ای ڈی پہ کارٹون لگے تھے۔ نوشابہ کرسٹل کی خوب صورت ٹیبل پہ لنچ کے لوازمات دیکھ رہی تھیں۔ مٹن، بریانی، رشین سیلڈ، ٹرائفل... چکن کباب... اور ٹھنڈی ٹھار کوک... کارپٹ پہ تیمور لیٹا ہوا تھا۔ کشن سر کے نیچے رکھے۔ سینے کے اوپر لیپ ٹاپ روشن تھا۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پہ تیزی سے حرکت کرتی اچانک رک گئی تھیں۔ جس طرح کھانے کے لیے آواز دیتی نوشابہ رک گئی تھیں۔

"کل کہاں آلو تھے۔ اتنی مبالغہ آمیزی مت کیا کرو۔ کل قیمہ تھا۔" نیلم کی خفگی بھری آواز ابھری تھی۔ اور پھر جینا تنک کر بولی۔

"قیمہ جسٹ نہیں تھا۔ آلو قیمہ تھا۔ یاد رہے آلو زیادہ قیمہ کم۔ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ امی بس سونگھنے کے لیے قیمہ ڈالتی ہیں۔" جینا کے ترنت، دو ٹوک برجستہ جواب پہ تیمور عش عش کر اٹھا تھا۔

"واہ، میری شہزادی... ایسے تائی کو جواب دیا کرو۔" وہ جیسے سردھن کر رہ گیا تھا۔

"بدتمیزی نہیں چلے گی۔" نیلم نے ذرا ترشی سے ٹوکا۔

"بس دال چلے گی۔ سبزی چلے گی۔" جینا اور بیلا نے کورس میں گا کر سنایا تھا۔ نیلم نے یقیناً" اپنا سر پیٹا ہوگا۔

"بہت لمبی ہیں تمہاری زبانیں... کاٹ ڈالوں گی کسی دن۔" یہ کرخت آواز تائی فرحت کی تھی۔ جیسے سارا مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔ لیکن مزہ کرکرا کہاں ہوا تھا۔ مزہ تو اب آرہا تھا۔ لیکن مزے سے پہلے والا جینا کا جواب؟

"تو کاٹ دیں... کم از کم اپنی اپنی زبان کٹوا کر بھون لیں گے۔ ایک ٹائم اچھا کھانا تو ملے گا۔" جینا کے غصے بھرے الفاظ نے نوشابہ اور تیمور کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔

تیمور کا دل بھر آیا۔ کیا اس کی بیٹیاں کھانے تک کے لیے ترستی تھیں؟ ایک اچھے کھانے کے لیے؟ اچھی خوراک کے لیے اور وہ خود نعمتوں کے انبار تلے کس چین سے بیٹھا تھا؟ وہ بے قرار سا ہو گیا تھا۔

"کس بدزبان کی اولاد ہو... آخر اسی پہ جاؤ گی بے فیض لڑکیو! اپنا دل نکال کر بھی تمہیں کھلا دیا تو پھر بھی کہو گی ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملا کبھی۔" فرحت کی ترش آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔

"اپنا دل کیوں دیتی ہیں ہمیں... کسی چکن کو بس کھلا دیں۔" بیلا معصومیت سے بولی تھی۔

"منحوسو! کبھی تم نے چکن نہیں دیکھا۔" تائی تو بس پھٹ پڑی تھیں۔

"دیکھتے ہیں مہینے میں ایک بار۔ وہ بھی آدمی آدمی بوٹی۔" جینا نے ترنت جواب دیا تھا۔

"بس آئندہ وہ بھی نہیں ملے گی۔" تائی نے اپنا بے رحمانہ فیصلہ سنا دیا تھا۔ جینا بیلا کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تو نہ ملے۔ اوپر ممی ہیں نا... وہ ہمیں چوری چوری..." بیلا جیسے ہی پول کھولنے لگی تھی جینا نے فٹ اسے پیر مار کر چپ کروا دیا تھا۔ وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ایڈیٹ۔" جینا نے اسے گھورا تھا۔ کیونکہ فرحت ان کے ادھورے جملے کا مفہوم سمجھ گئی تھیں اور ان کا غصہ بس آسمان کو چھونے لگا تھا۔

"یہ اوپر والوں سے "دوستانے" بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ ورنہ اتنی سزا دوں گی کہ نانی یاد آجائے گی۔" وہ روانی میں بولتی ہوئی جینا بیلا کی کمی تھی پہ رکی تھیں۔





پھر انہوں نے جینا بیلا کو گھور کر دیکھا تھا۔

"نانی کہیں جائیں گی تو یاد آئیں گی۔ جو سامنے ہو اسے یاد کیا کرنا۔" ان کے برجستہ جواب پہ تیمور اور نوشابہ کو بھی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"ارے، باپ کی طرح کسی پوائنٹ کو مس نہ ہونے دینا۔" فرحت نے زچ ہو کر کہا تھا۔

"اس کی بھی اتنی لمبی زبان ہے۔" فرحت نے یقیناً اوپر کی طرف دیکھ کر جملہ پھینکا ہوگا۔

"کیا ڈیڈی کی؟" بیلا نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

فرحت کو غیض چڑھ گیا تھا۔

"وہ کمینہ تمہارا ڈیڈی کہاں سے ہو گیا؟" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں کو ایک ایک تھپڑ لگا کر منہ بند کروا دیتیں۔ نیلم شاید فون سننے چلی گئی تھی۔ فرحت نے کھا جانے والی نظروں سے ان "پٹاخوں" کو دیکھا تھا۔

"خود ہی تو کہا ہے۔ اپنے باپ کی طرح کوئی پوائنٹ مس نہ ہونے دینا۔ اور ہمارا باپ تو ڈیڈی ہیں۔ وہ جو بہت لولی اینڈ بیوٹی فل ہیں۔" بیلا نے معصومیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ارے مر چکا تمہارا باپ... دس سال پہلے۔" فرحت نے سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔

"بٹ اللہ نے ڈیڈی کو واپس بھیج دیا ہے امی! تاکہ سوہا کے پاپا کو دیکھ کر ہم جیلس اور ڈس ہارٹ نہ ہوں۔" جینا نے فرحت کو اپنے تئیں سمجھانا چاہا تھا۔ ساتھ معصومیت سے اپنے دل کا حال بھی بیان کر دیا۔

نوشابہ اور تیمور کے دل جیسے کسی شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ دونوں ماں بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظر چرا لی تھی۔

"بس بک بک لگائے رکھنا۔ کھانا مرنا کچھ نا۔" فرحت اس برجستہ جواب پہ لاجواب ہو کر ان پہ چڑھ دوڑی تھیں۔ پھر بچیاں بھی بحث سے تنگ آگئیں... یا بھوک سے نڈھال ہو کر آلو کھانے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔ ان کی آوازیں آنا بند ہوئیں تو نوشابہ نے جلدی سے ایک ٹرے مختلف لوازمات کی سجا کر جالی دار رومال سے ڈھک دی۔ مٹن، بریانی، چکن کباب، ٹرائفل اور کوک کی بوتل بھی۔

"تیمور! نیچے دے کر آؤ۔ میں گئی تو بھابھی نہ میرے منہ پہ الٹا دیں گی۔ تم مقابلہ کر سکتے ہو۔ میں نہیں کر سکتی۔" نوشابہ نے آنکھوں کی نمی چھپا کر کہا تو تیمور نے ٹرے اٹھا کر نیچے جانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

گرمی کا زور آج بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ باہر لو کے تھپیڑے تھے اور اوپر سے لوڈشیڈنگ کا عذاب الگ۔ آج صبح سے لائٹ نہیں تھی اور تپش جان نکال رہی تھی۔

اوپر سے آج چھٹی کا دن تھا۔ اور پھر خرم کی اماں نے اپنی آمد کا بتا کر فرحت کو سخت بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک تو آنے والی خاص مہمان خاتون کی خاطر مدارات کا مسئلہ۔ پھر جینا بیلا کی گھر میں موجودگی۔ وہ تو جان کھا مارتی تھیں۔ اتنا شور، ہنگامہ کرتی تھیں کہ حد نہیں۔ پورا گھر سر پہ اٹھا لیتی تھیں۔

اور اس وقت تو انہوں نے گرمی کا رونا ڈالا ہوا تھا۔

دو مرتبہ نہا چکنے کے باوجود گرمی گرمی چلا رہی تھیں۔ فرحت ان کے بھونپو سے تنگ آکر تھیلا بغل میں دبا کر بازار نکل گئیں۔ خرم کی اماں کے لیے اچھی سی دعوت کا اہتمام کرنا تھا۔ سو راشن اور سودا وغیرہ لینے خود چلی گئی تھیں۔ پیچھے سے نیلم نے سیماں کو ساتھ لگا کر سارا گھر دھو ڈالا تھا۔

جب وہ صفائی کر چکی تو جینا ٹھنکتی ہوئی آگئی۔

"کل پیپر ہے اور آج اس قدر گرمی کہ حد نہیں۔ پنکھے کے بغیر کتاب پکڑنے کو دل نہیں کرتا۔ پسینہ کتابوں پہ گرتا ہے۔" جینا کے اپنے مسائل بے شمار تھے۔ نیلم جو جار سے چاول نکال رہی تھی لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ لائٹ تو ابھی آنے والی نہیں تھی۔ پھر کیا کرے۔ اچانک اسے خیال آیا تھا۔

"سوہا کے گھر چلی جاؤ... وہاں جنریٹر ہے۔" وہ چاول

چنتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔

"اور تیاری کون کروائے گا؟" جینا چڑ کر رہ گئی تھی کیونکہ نیلی کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔

"میں رات کو کروادوں گی۔"

"اگر لائٹ نہ ہوئی تو؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"پھر میں کیا کروں۔۔۔ ابھی بیٹھو کروا دیتی ہوں۔" نیلی کا پہلے سے الجھا پریشان ذہن کچھ اور پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جانتی بھی تھی کہ خوامخواہ بچیوں پہ اپنی فرسٹریشن نکال رہی ہے۔ پریشانی، الجھاؤ، تفکر کچھ اور تھا، وجہ کچھ اور تھی ڈپریشن کچھ اور تھا، بس زیرِ عتاب جینا بیلا تھیں۔

"ابھی اتنا پسینہ آرہا ہے۔" جینا نے ٹھنک کر کہا۔

"تو پھر باہر مرو۔ میرا سر کیوں کھاتی ہو۔" وہ چاول بھگوتی نجانے کیوں اس قدر تلخ ہو رہی تھی۔ جیسے دل کہہ رہا تھا۔ جو ہونے والا تھا ٹھیک نہیں تھا۔ جو ہو رہا تھا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اوپر سے امی کا دباؤ، خرم کا اصرار، اس کی اماں کا بار بار ڈیٹ لینے کے لیے فون کرنا۔ کیونکہ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ نیلم کی طلاق ہو چکی ہے یا ابھی ہونے والی ہے۔ ان کے گمان میں علیحدگی کا مطلب مک مکا ہی تھا۔ انہوں نے خرم کو تنگ کر رکھا تھا کیونکہ وہ خود بیمار خاتون تھیں جلد از جلد اپنے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ خرم کی اماں تو اسی ہفتے میں نکاح چاہتی تھیں اور یہ ممکن نہیں تھا۔ کم از کم طلاق سے پہلے تو نہیں۔۔۔ اور فرحت نے کہا تھا یہ معاملہ وہ خود ہینڈل کرلیں گی۔ جانے کس طرح سے معاملہ ہینڈل ہو سکتا تھا؟ نیلم کو تو حالات پہلے سے بگڑتے نظر آرہے تھے، لیکن فرحت مطمئن تھیں۔ اوپر سے جینا بیلا کا تیمور سے اتنی جلدی گھل مل جانا۔ ان دونوں کا بس چلتا تو اوپر ہی گھسی رہتیں۔ نیچے آتی ہی نہ۔ وہاں پلازما ٹی وی تھا۔ کارٹونز تھے۔ ہر وقت جنریٹر چلتا تھا۔ پورا پورشن اے سی سے ٹھنڈا رہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر فریج دنیا جہاں کے فاسٹ فوڈ سے بھرا رہتا تھا۔ نوشابہ باؤل بھر بھر کے فروٹس کاٹ کر دیتیں۔ آئس کریم کھلاتیں۔ تیمور آرڈر پہ گرما گرم پزا منگواتا۔ شوارما، زنگر، ونگز۔۔۔ ان کی تو جیسے موج لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی عالی شان ہنڈا سوک پہ کئی مرتبہ جینا بیلا کو فرحت کی ہزار مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود باہر گھما لایا تھا۔ انہیں ہوٹلنگ کروائی۔ شاپنگ کروائی۔ وہ سارا شہر گھوم کر آئی تھیں۔ اس قدر خوش اور سرشار کہ نیلی نے پوری زندگی میں انہیں اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ اوپر سے سوہا اور اپنی فرینڈز پہ اپنے ڈیڑ ڈیڈی کی دھاک بٹھانا۔ کیونکہ سوہا کے لیے یہ انکشاف ہی معمولی نہیں تھا کہ اس کے انکل جینا بیلا کے ڈیڈی نکل آئے تھے۔

پھر پورچ میں دو ایک جیسی خوب صورت سائیکل بھی کھڑی ہو گئیں۔ باربی ہاؤس بھی آگیا۔ رنگ رنگ کے ریموٹ سے چلنے والے کھلونے، پلین، اسپورٹس کار، ہیلی، بس ہاؤس۔۔۔ تیمور جیسے ان کی ساری محرومیوں کو ایک ساتھ ہی ختم کر دینا چاہتا تھا اور وہ دونوں صبح و شام "ڈیڈی" کے نام کی تسبیح پڑھتی تھیں۔ کیا یہ ٹھیک تھا اور کیا یہ واقعی ہی ٹھیک تھا؟ نیلم اس صورت حال پہ پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی؟ جس طرح تیمور اچانک آکر جینا بیلا کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ جس طرح وہ اپنے باپ سے اٹیچ ہو چکی تھیں، کیا یہ نیلم کے حق میں بہتر تھا؟ ہرگز نہیں۔۔۔ قطعاً نہیں۔ وہ انہیں کیسے روکتی؟ کس طرح سے روکتی؟ کیونکہ ایک بات تو طے تھی۔ تیمور گنگا میں بھی نہا کر آتا، تب بھی اسے قبول نہیں تھا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں۔ جینا بیلا کے لیے بھی نہیں۔ نیلم اسے اپنے دل سے اکھاڑ چکی تھی۔ اپنے دل سے نکال چکی تھی۔ تیمور کبھی بھی اپنی جگہ پہ نہیں آسکتا تھا۔ اپنا کھویا ہوا مقام بحال نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل کی راجدھانی پہ دوبارہ قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح وہ انہیں دھتکار گیا تھا۔ نیلم بھی اسے دھتکار دینا چاہتی تھی اور اس وقت نیلم کا دماغ جل رہا تھا۔ وجود جل رہا تھا۔ وہ جب جب تیمور کے بچیوں سے بڑھتے التفات دیکھتی اس کا وجود کسی تندور میں بھل بھل جلنے لگتا تھا۔ اسے اب خیال آیا تھا؟ اب احساس ہوا تھا؟ کیا وہ جینا بیلا کو اپنی لمارات اور



وسائل کی زنجیر میں جکڑ کر نیلم سے دور کر لینا چاہتا تھا؟ کیا وہ اس سازش کے تحت آیا تھا؟ کیا وہ جینا بیلا کو نیلم سے چھیننے کے لیے آیا تھا؟ اور چھین تو وہ چکا ہی تھا۔ ان پہ عنایات کی برسات کر کر کے۔ اب جینا بیلا کو نیلم کا لایا کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ اس کا پکایا بھی پسند نہیں آتا تھا۔ نچلا پورشن بھی پسند نہیں آتا تھا۔ تو گویا تیمور جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ اس نے اپنا مقصد پا لیا تھا؟

کیا یہ سوچوں کے اژدھام کم تھے جو خرم کی اماں فرحت سے مہینہ۔۔۔ بعد کی تاریخ زبردستی لے کر چلی گئی تھیں اور فرحت نے بھی حالات کو پلٹتا دیکھ کر تاریخ دے دی تھی۔ کیونکہ عدالتی کارروائی اسی ہفتے کے دوران ہو جانی تھی۔ تیمور کو آج نہ سہی۔۔۔ کل تک ضرور نوٹس مل جاتا۔ پہلی تاریخ پہ یہ مک مکا ہو جانا تھا اور نیلم کا دماغ ان دنوں اذیت ناک حد تک سوچوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ کیا کرتی؟ خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیتی؟ جو امی کر رہی تھیں بس آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پہ چلتی رہتی۔۔۔ کیا یہ بہتر تھا؟ نیلم کے لیے بہتر تھا؟ وہ رات رات بھر پریشان رہتی تھی۔ اس کی بے چینی ختم نہیں ہوتی تھی۔ اضطراب جان نہیں چھوڑتا تھا۔ نیلم انتہائی چڑچڑی اور بے زار ہوتی جا رہی تھی اور فرحت نے چپکے چپکے اس کے عقدِ ثانی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ تو کیا خرم، تیمور سے بڑھ کر اس کی بیٹیوں کا باپ ثابت ہو سکتا تھا؟ خرم جتنا اچھا ہوتا، لیکن بچیوں کا محرم تو نہ ہوتا؟ اور اس صبح جینا بیلا کا آخری پیپر تھا۔ رات بھی تیمور انہیں تیاری کروانے کے لیے اوپر لے گیا تھا۔ نیچے لائٹ نہیں تھی۔ فرحت نے تو بہت باتیں سنائی تھیں، لیکن نیلم خاموش ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کم از کم آخری پیپر کی تیاری ٹھیک سے ہو جائے۔ ویسے بھی روکنا بے فائدہ تھا۔ اگر وہ حق جتانے آگیا تھا تو پھر کورٹ سے ملنے ملانے کا سرٹیفکیٹ اور صبح صبح ایک مرتبہ پھر آشیانہ ثقلین کے نچلے پورشن میں ہنگامہ بپا تھا۔ آج وین والے نے چھٹی کرلی تھی۔ اچانک وین خراب ہوئی اور آئی ہی نا۔۔۔ پہلے پتا ہوتا تو وقاص ہی چھوڑ آتا، لیکن وقاص آؤٹ آف سٹی تھا۔ یوں سوہا بھی گھر میں تھی۔ اسکول نہیں جا سکی اور ادھر جینا بیلا نے قیامت اٹھا رکھی تھی۔ وہ پیپر کسی طرح بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سوہا تو ایوریج اسٹوڈنٹ تھی، جبکہ یہ دونوں برائٹ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتی تھیں۔ اب وین کے نہ آنے میں بھی نیلم کا ہی قصور تھا۔

"کہا بھی تھا چھوٹی سی مہران لے لیں۔۔۔ لیکن آپ کو ہماری پروا ہی نہیں۔" جینا بیلا ہمیشہ کی طرح باؤلی پنچنی غصے میں چیخ رہی تھیں اور ان کی پکار اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔

"میں رکشہ پہ چھوڑ آتی ہوں۔" نیلم نے ہاتھ میں پکڑا پیڑا واپس رکھا اور جلدی سے چادر لینے چلی گئی۔

"رکشہ دو گھنٹے میں چھوڑے گا۔ تب تک اسکول گیٹ بند ہو چکا ہو گا۔ انکل اندر نہیں جانے دیں گے۔" بیلا روہانسی ہو رہی تھی۔ اوپر ان کی آوازوں پر تیمور خود ہی چابی اٹھا کر نیچے آنے لگا تھا۔

"تو پھر نہ جاؤ۔" نیلم چڑ گئی تھی۔ تب فرحت کمرے سے باہر نکل کر آئیں۔ اوپر کی طرف منہ کر کے ذرا اونچی آواز میں بولی تھیں۔ "اس نواب آف کالا باغ سے کہو چھوڑ آئے۔ ویسے تو پورا شہر اس کے کندھوں پہ چڑھ کر گھومتی ہو۔ اسکول نہیں چھوڑ کر آتا۔" فرحت کی بات ابھی نامکمل ہی تھی کہ جب نواب آف کالا باغ سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔ کچھ دیر پہلے مبین کی بھی کال آئی تھی کہ سوہا کو اسکول چھوڑ آئے۔ اس نے تخت پر سے بیلا جینا کے بیگ اٹھائے تھے۔ پھر دونوں کے بازو پکڑ کر باہر جاتے ہوئے خاص طور پر فرحت اور نیلم کو سناتا ہوا باہر نکلا تھا۔

"نواب آف کالا باغ سے بہتر آپ کو کوئی نہیں ملے گا۔ سارے دور کے ڈھول سہانے ہیں۔ جو ٹھوکر لگی تو سمجھ میں بات میری آئے گی۔" وہ دھیمی سلگتی آواز میں بولتا ہوا گیا تھا۔ یوں کہ نیلم سن سی ہو گئی تھی۔ تیمور کے جاتے ہی فرحت نے خوامخواہ سر جھٹکا اور نیلم کے سر ہو گئی تھیں۔ پھر جو انہوں نے بات کی

تھی۔ نیلم کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور آواز حلق سے چیخ کی مانند نکلی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں امی!" صدمے کے مارے نیلم کا سر چکرانے لگا تھا۔ "کچھ غلط نہیں کہا۔ تمہاری ٹینشن دور ہو جائے گی۔ لڑکیاں اپنے باپ کے پاس رہیں گی۔ تمہارے سر سے بلائیں اتر جائیں گی۔ تمہیں اور کیا چاہیے؟" فرحت نے بڑے طریقے سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ لیکن وہ ایسے بدک گئی تھی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہوا۔

"میں ان کی ماں ہوں امی... ناگن نہیں اور مجھے شادی کا کوئی شوق نہیں چڑھا تھا۔ میں نے اگر زہر بھرا یہ گھونٹ بھرنا بھی چاہا ہے تو محض اپنی بیٹیوں کے لیے اور اگر بچیاں تیمور کو ہی دینی تھیں تو پھر مجھے دوبارہ ڈولی چڑھنے کا شوق نہیں۔" اس کی قطعیت بھرے دوٹوک الفاظ پر فرحت چپکی رہ گئی تھیں۔ پھر دوبارہ انہوں نے اس موضوع پہ بات ہی نہیں کی تھی اور یہ اسی دوپہر کا قصہ تھا۔ قریب گیارہ بجے کے بعد ڈاکیا ڈاک دے کر گیا تو دوسرے ہی لمحے تیمور آگ بگولا سا وکیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ثقلین اور نوشابہ بھی آگئے تھے۔ اس ڈاک میں خلع کا نوٹس تھا جو نیلم کی طرف سے تیمور کو بھیجا گیا تھا۔ وکیل صاحب اس معاملے میں بے بس تھے کیونکہ کار مختار یہ دونوں ماں بیٹی تھیں۔ وکیل صاحب کو بتاتا تو دور بھنک تک پڑنے نہیں دی تھی۔ پھر ثقلین، نوشابہ کی معافی تلافی کے باوجود فرحت کی اکڑ کم نہ ہوئی تھی۔ وہ نہ ان کی بات سن رہی تھیں۔ نہ انہیں بولنے کا موقع دے رہی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت لینے پہ تیار تھیں۔ تیمور نا بابا اپنا غصہ اور بھڑاس نکال کر نیلم کو ڈھونڈتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ نیلم غیر متوقع تیمور کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر تیمور نے نوٹس کو پرزہ پرزہ کرکے نیلم کے منہ پہ دے مارا تھا۔

"تمہیں اتنا آگے تک جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھ سے دوٹوک بات کرلیتیں۔ تمہیں آزادی چاہیے تھی؟" تیمور آگ بگولا سا بھڑک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور ماتھے کی رگ شدت ضبط سے پھڑک رہی تھی۔ اس نے بمشکل خود پہ کنٹرول کر رکھا تھا۔ ورنہ تو نیلم کا منہ توڑ دینے کو دل کر رہا تھا۔

"تمہیں اس قدر گرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے بغیر بھی تمہاری تمنا پوری ہو سکتی تھی۔" وہ چیخ چیخ کر اور بول بول کر تھک گیا تھا۔ پھر اس کا لہجہ بھی دھیما پڑ گیا۔ الفاظ میں بھی ملائمت آگئی تھی اور لہجہ شدید شکستہ قسم کا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر پلنگ پہ بیٹھ گیا۔ جیسے اسے نیلم سے اس انتہائی قدم کی امید نہیں تھی۔ پھر کئی لمحے خاموشی سے پھسلتے چلے گئے تھے۔ کمرے میں دبیز سکوت چھایا رہا۔ نیلم کو ایک دم گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر وہ تیمور کی موجودگی سے شدید الجھن محسوس کر رہی تھی۔ نیلم اٹھ کر باہر نکلنے لگی تو تیمور سرعت سے نیلم کے سامنے آگیا تھا۔

"تم میری بات سے بغیر نہیں جا سکتی۔" وہ اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ نیلم کچھ دیر کے لیے سوچتی رہی تھی۔ پھر اس نے بلا کے سرد اور برفیلے لہجے میں محض اتنا کہا۔

"بولو... تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔" وہ گھڑی پہ نگاہ جما کر کھڑی تھی۔ تیمور کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اس کی بات سننے کے لیے رک چکی تھی۔ ورنہ ایسی کئی کوششیں وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ نیلم نے دل میں ایسی گرہ لگائی تھی کہ اسے کھولنے کے لیے بھی ہاتھ آگے بڑھنے نہ دیتی۔ اس وقت تیمور کے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ نیلم دس منٹ کے لیے ہی سہی رک ضرور گئی تھی اور تیمور کو سوچنے کے لیے تمہید باندھنے کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ ایسے ہی غیر متوازی لہجے اور بے ترتیب الفاظ سے بولتا رہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں؟ اچانک نکاح اور شادی سے؟ پاپا پہ بننے والے غبن کے کیس اور جھوٹے الزام سے؟ یا ممی پاپا کی اچانک بیماری اور بدلتے حالات سے؟ میری زندگی میں بہت اچانک تکلیف دہ موڑ آئے تھے۔ پاپا پہ غبن کا جھوٹا الزام لگا اور ان کی جاب چھوٹ گئی تھی۔ سرکاری نوکری تو تھی نہیں جو جی پی فنڈ یا پنشن کا سہارا ہوتا۔ پاپا کو صدمے سے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور ان سے پہلے ممی کو تمہاری امی نے ٹارچر کرکے ہسپتال پہنچا دیا۔ پھر میرا نکاح شادی اور بچوں کی آمد کا سلسلہ... میں دنوں میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ جمع جتھا تھا کوئی نہیں۔ حالات اتنے خراب ہو جائیں گے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

یہ سب حالات تو تمہارے سامنے تھے۔ انہیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل قصہ تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پہ تائی کے طعنوں، کوسنوں نے ذلت کی انتہا پہ پہنچا دیا تھا۔ وہ مجھے نکمے پن کے طعنے مار مار کر تھکتی نہیں تھیں۔ اوپر سے جو کچھ تھا وہ ممی پاپا کے علاج پہ خرچ ہو رہا تھا۔ نہ میرے پاس ہنر تھا، نہ تعلیم جو کہیں اچھی جاب پہ لگ جاتا۔ اوپر سے سرمایہ تھا نہیں کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کرلیتا۔

حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔ نوبت فاقوں پہ آرہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں اگر یہاں رہا تو کچھ کر نہیں پاؤں گا۔ یہاں بیروزگاری تھی۔ افلاس تھی۔ کوئی موقع بھی نہیں تھا۔ سبب کہاں سے لگتا؟ پھر ان ہی دنوں میرا ایک ایجنٹ سے رابطہ ہوا۔ اس نے مجھ سے لاکھوں کے حساب سے رقم مانگی۔ وہ مجھے اٹلی کا پکا ویزہ دے رہا تھا۔ میں نے تم سے زیورات مانگے تو تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تم پہ شدید غصہ آیا۔ تم ان حالات میں میری مدد کرنے کی بجائے الٹا مجھے ستا رہی تھی، مجھے غصہ آیا اور میں نے تمہیں تھپڑ مار دیا اور بس اس تھپڑ کے بعد میری بدبختی کے دن شروع ہو گئے تھے۔

میں آج بھی اس تھپڑ پہ پچھتاتا ہوں۔ میں آج بھی اس وقت پہ پچھتاتا ہوں۔

مجھے لگتا تھا کچھ تمہیں خود بھی مجھ پہ غصہ تھا اور کچھ تمہیں تائی نے بھڑکا رکھا تھا۔ تائی کا اول روز سے ہی ممی کے ساتھ کلیش تھا۔ وہ مجھے بھی پسند نہیں کرتی تھیں اور میں نے تائی کی ناپسندیدگی کے ساتھ کمپرومائز کرلیا تھا۔ میں جانتا بھی تھا، تائی کی عادت کو، مگر پھر بھی ان کے طعنے مجھے آگ بگولا کرتے تھے۔ مجھے جنون چڑھا ہوا تھا کچھ بن کر دکھانے کا اور اپنے حالات پہلے کی طرح بہتر کرنے کا اور اس کے لیے مجھے وقت درکار تھا۔ محنت بھی... مواقع بھی... سرمایہ بھی... پھر یوں ہوا میں نے ایک دوست سے لمبا چوڑا ادھار پکڑا اور غیر قانونی رستے سے یونان کی طرف نکل گیا۔ اس دوران میں نے کتنی مشکلیں اٹھائے، کتنی تکلیفیں جھیلیں اور کتنے کتنے دن بے ہوشی میں "لانچوں" کے قبر نما کونوں کھدروں میں بے ہوشی کے عالم میں سفر کیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس کو سن کر کیا کرو گی؟ یہ بڑی صبر آزما تکلیف دہ یادوں میں ڈوبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر میں نے یونان تین سال بغیر کسی شناخت ویزے اور لیگل سرٹیفکیٹ کے چھپ کر کام کیا اور پیسے جمع کرتا رہا۔ میری قسمت کچھ یہاں پہ تھوڑا ساتھ دیتی رہی اور مجھے اٹلی جانے کا سبب مل گیا۔ گوکہ میں اٹلی بھی غیر قانونی رستوں سے گیا۔ اگلے دو سال میں نے اٹلی میں چھپ چھپ کر گزارے تھے۔ لیکن اٹلی آنے سے پہلے میرے کینیڈین دوست نے میرے بہت اصرار اور منت سماجت پہ میرے ممی، پاپا کو کینیڈا نہ صرف اسپانسر کیا بلکہ ان کا علاج بھی کروالیا اور انہیں اپنے گھر پورے چھ سال رہائش بھی دی۔ ان کا خیال بھی رکھا۔ میں عمر بھر اس کا احسان نہیں اتار سکتا۔ جو اس نے میری ذات پہ کیا تھا اور ایک غیر قومیت، نسل اور غیر مذہب کے انسان نے کیا تھا۔ وہ مجھے اپنوں سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اپنوں نے تو زیورات تک چھپا لیے تھے۔ میں نے اپنے دوست کو یونان کے ساحل سے ایجنٹ کے موبائل سے آخری کال کی تھی۔ جس میں اپنے ماں، باپ کے بارے میں التجا کی اور گھر کا ایڈریس وغیرہ لکھوا دیا۔ مجھے ممی، پاپا کی بہت فکر تھی۔ ان کا علاج، ان کی بیماری، یوں ممی، پاپا میرے دوست پال کی مدد سے کینیڈا تو پہنچ گئے، مگر پورے کینیڈا میں اپنے بیٹے کو تلاش کرتے پاگل ہونے لگے تھے۔ وہ دن بڑے عذاب ناک تھے ان کے لیے۔ میں ان دنوں یونان میں دھکے کھا رہا تھا۔ پھر تین سال اٹلی رہا۔ وہاں سے بڑی

مشکل اور کٹھن صورت حال سے گزرتا میں کینیڈا پہنچا اور وہاں سے گرفتار ہو گیا تھا۔

چھ سال بعد میں ممی' پاپا سے ملنے کا جنون لے کر جیسے ہی کینیڈا آیا۔ وہاں مجھے پولیس نے پکڑ لیا۔ ڈیڑھ سال میں جیل میں زیر حراست رہا اور یوں بھولا پتا رہا۔ بس بلال مجھ سے ملنے آتا تھا اور اسی کی مہربانی سے میرا کیس بھی کچھ مضبوط ہوا اور بالآخر قید سے رہائی مل گئی تھی۔

پھر آگے کی مشقت بھری کہانی کیسے سناؤں۔ یہ دس منٹ تو ان دس سالوں کی اذیت کے لیے بہت کم ہیں۔ مجھے دس سال اور بھی لگیں تب بھی اپنے دکھوں' محنت' مشقت اور جدائیوں کی اس داستان کو سنا نہ پاؤں۔ اگلے دو سال میں ننھیال کے قرض اتارے اور اس دوران میں نے گھر ایک سو اکہتر فون کیے۔ پہلا ڈرافٹ وقاص کے نام سے بنوا کر بھیجا جو تائی نے وقاص کے منہ پر دے مارا تھا۔ پھر اگلے سات ڈرافٹس بھی ایسے ہی برنہ برنہ ہوتے رہے تھے۔ میں نے اٹلی اور یونان میں قیام کے دوران جتنی مرتبہ کال کی اتنی مرتبہ تائی نے کال ڈراپ کر دی۔ نہ تم سے بات کروائی' نہ بچیوں سے۔ میں بڑے مشکل حالات میں چھ چھ ماہ بعد کال کیا کرتا تھا اور تائی ہر دفعہ یہ ہی جواب دیتی تھیں۔

"میں کسی تیمور کو نہیں جانتی۔ تیمور ہمارے لیے مر چکا ہے۔"

اس کے باوجود میں کبھی بھی تم لوگوں سے لاتعلق نہیں رہا۔ تم جو ایک تھپڑ کو ایشو بنا کر ایسی روٹھیں کہ ابھی تک مان کے نہ دیں۔ اس وقت میں جس ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ مجھے ہر بات غلط اور بری دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اللہ کی قسم! تمہیں اس تھپڑ کو مارنے کی بڑی لمبی سزا بھگتی ہے۔ اتنے سال وطن بدر رہا ہوں۔ خوار ہوتا رہا ہوں اور تائی کو کچھ بن کے دکھا دینے اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے چکر میں بڑی خواری اٹھائی ہے۔ پھر وقاص نے مجھے بتایا۔ ادھر تائی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ مجھے جلدی واپس آجانا چاہیے اور پھر میں سب کچھ سمیٹ کر واپس آگیا۔ اب تمہارے سامنے ہوں۔ جو چاہے سزا دو۔ مگر جدائیوں کی سزا مت دینا۔ بڑی لمبی جدائی کاٹ کر آیا ہوں اور حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی دوست کی بیوہ بہن سے شادی نہیں کی۔ بلکہ مجھے شادی کرنے کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ اگر ملتا تو شاید کر ہی لیتا۔" وہ تھکن سے ٹوٹتے لہجے میں اپنی داستان مشقت کو دس منٹوں میں سنا تا لمحہ بھر کے لیے آخر میں شوخ ہوا تھا' لیکن نیلم کے مزاج اور چہرے کی سنجیدگی سے قدرے پریشان ہو گیا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ نیلم کی بدگمانی اب تک دور ہو جائے گی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر پریشان اور غم زدہ ہو گیا۔ نیلم پہلے کی طرح ہی سنجیدہ تھی۔ برف کی طرح سرد تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہی لاتعلق اور اکھڑی اکھڑی تھی۔ یعنی نیلم کا دل صاف نہیں ہوا تھا؟ نیلم کو تیمور کی کسی بات پہ یقین نہیں آیا تھا؟ وہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا؟ یعنی وہ نیلم کے دل سے اپنی محبت کو کھو چکا تھا؟ تیمور کو بڑا زوردار دھچکا لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیلم کو دیکھتا رہا۔

"بس یا کچھ اور؟" نیلم نے اتنی دیر کی خاموشی کو توڑ کر کہا بھی تو کیا؟ تیمور کو ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ یہ نیلم تو کوئی اور تھی۔ یہ نیلم وہ نہیں تھی جسے تیمور چھوڑ کر گیا تھا۔ نیلم بدل گئی تھی؟ یا وقت بدل گیا تھا؟

"تم کیا سمجھتے ہو؟ چار مکالمے بول کر میرا دل جیت لو گے اور میں تمہیں صبح کا بھولا سمجھ کر خوش آمدید کہوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ کل کورٹ میں پہلی اور آخری تاریخ ہوگی۔ اگر دل چاہے تو کورٹ میں آجانا۔ ورنہ یہاں ہی۔ مجھے تمہاری طرف سے فیصلے کا انتظار رہے گا۔ تحریری فیصلے کا۔" نیلم نے ایک سلگتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہاں دیوار کے پاس ایک سایہ تھا۔ وہ فرحت تھیں جو تیمور کے ہر ہر سچ پہ شرمندہ اور پشیمانی کھڑی تھیں۔ انتہائی شرمسار' جھکے ہوئے سر کے ساتھ' اپنی بہت سی غلط بیانیوں اور جھوٹوں کے ہمراہ۔ مگر ان کی بیٹی ان ہی



کی طرح ایک غلط فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ فرحت کی ہی بیٹی تھی۔ کچھ اچھا فیصلہ کس طرح سے کرتی۔

☼ ☼ ☼

کورٹ میں دس بجے "پکار" تھی۔ نیلم نے بینک سے چھٹی کر لی تھی۔ لیکن وہ صبح ہی صبح پرس اٹھا کر گھر سے نکل آئی۔ لیکن آنے سے پہلے فرحت نے نیلم کو بے ساختہ روک لیا تھا۔ وہ رات تیمور سے ہونے والی باتیں ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن نیلم کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے ان کی کوئی بات نہیں سنی تھی اور وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس نے بینک بھی نہیں جانا تھا اور کورٹ کا بھی ابھی وقت نہیں تھا۔ پھر وہ کہاں جا رہی تھی؟ پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اونچی نیچی تنگ گلیوں میں بمشکل پہنچی تھی۔ پھر ایک خستہ حال تین مرلے پہ پھیلے مکان تک جیسے تیسے پہنچ گئی۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا غلیظ اور گندا مکان تھا۔ پورے صحن میں مرغیوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ نیلم کا جی متلانے لگا۔ الٹی آنے لگی۔ وہ تو بہت صفائی پسند تھی۔ اس قدر گندگی پہ جی الٹنے لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ دوپٹہ ناک پہ رکھ لیا اور مرغیوں کی فرش پہ پھیلائی تازہ غلاظت اور فضلات سے بچتی بچاتی اندرونی بند دروازے تک پہنچ گئی۔ جس کے آگے بدرنگ چق پڑی تھی۔ اس نے ابھی چق کو ہٹانا ہی چاہا تھا جب اندر سے ایک کرخت آواز نیلم کی سماعتوں میں پڑی۔ اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔

"تیرا تو کام ہی اٹک گیا پپو! بڑے ماٹھے نصیب ہیں تیرے' لگتا تا ہی' ہاتھ آئی لکشمی ہمارے پاس آوے۔" یہ مردانہ آواز تھی۔ کسی بزرگ کی۔ ابا ٹائپ بزرگ اور اس کے بعد آوازوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ نیلم پہلے سن ہوئی۔ پھر گم صم ہوئی' پھر بدحواس ہوئی اور پھر جیسے حواسوں میں آگئی۔

"سونے کی مرغی ملے گی۔ دو سفید چوزیوں کے ساتھ۔ یہ سارا گند اٹھا کر باہر کروں گی۔ انڈا انڈا بیچے تھک گئی ہوں۔ دیکھنا تو پپو کے نصیب کیسے چمکیں گے۔ چٹی دودھ زنانی۔ دو چٹی دودھ کڑیاں۔" یہ آواز بہت جانی پہچانی تھی۔ بہت سنی سنائی تھی۔ لیکن تب اس لہجے میں شہد گھلا ہوا تھا اور اب۔؟

"اور چٹی دودھ زنانی کے ساتھ بنا بنایا اتنی خوب صورت کالونی میں مکان۔ ذاتی اپنا۔ نہ کرائے کا جھنجٹ' نہ مالک مکان کی گالیاں سننے کا عذاب۔" یہ پپو کا بھائی تھا۔ خوشی سے پھٹا ہوا۔

"زنانی بھی تنخواہ دار۔ اتنی لمبی چوڑی تنخواہ والی۔ پورے۔۔۔ ہزار۔" پپو کی اماں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ پھر کوئی لڑکی دور کی کوڑی لائی تھی۔

"وہ اپنی لڑکیاں ساتھ لائے گی؟" کسی لڑکی نے چمک کر پوچھا۔

"تو کیا پھینک آئے گی؟" پپو کی اماں غصے سے تڑخی تھی۔

"پپو تو فائدے میں رہے گا۔ کبھی زنانی ہاتھ آئے گی' کبھی اس کی لڑکیاں۔" کسی بے غیرت نے زوردار قہقہہ لگایا تھا' جس میں پپو یعنی خرم کی مکروہ آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

"اب مرغی پھنسی پھنسائی۔ اپنے بندے سے طلاق لے گی آج۔" خرم اپنے گھر والوں کو مژدہ جاں فزا سنا رہا تھا۔ وہ لوگ اب لمبی چوڑی پلاننگ میں مصروف ہو چکے تھے' لیکن نیلم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی اور اس کے سر پہ آسمان آن گرا تھا۔ وہ الٹے قدموں اس غلیظ گھر سے نکل رہی تھی۔ وہ آنسو روکتی' چیخیں دباتی بھاگ رہی تھی۔ اندھا دھند' بغیر پیچھے دیکھے۔ جیسے اگر پیچھے دیکھے گی تو بڑے بڑے ناگ اسے ڈس لیں گے۔ ان کا زہر اسے نیل نیل کر دے گا اور وہ کھڑے کھڑے صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ گندی گلی کا موڑ مڑتے ہوئے صاف سڑک کی طرف بھاگتے وہ اب بھی پیچھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ مکروہ لوگ اور مکروہ آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب نیلم سڑک اور ستھرے رستے پہ کھڑی تھی۔ بمشکل سنبھلتی ہوئی۔ بمشکل اپنی سانسیں رواں کرتی

ہوئی۔ بمشکل اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے خود کو حواسوں میں لاتے ہوئے۔ اس نے اپنے چہرے پہ کئی مرتبہ ہاتھ پھیرا تھا اور اپنے پیر کئی مرتبہ جھاڑے تھے۔ وہ اس گندی گلی اور گندے مکروہ لوگوں کی ہر غلاظت سے بچ کر آگئی تھی۔ یہ نیلم کے لیے مقام شکر تھا۔

خرم نام کا عفریت، جو اس کی ماں کے اصرار اور ضد سے نیلم کے پیچھے پڑا۔ آج اس کی اصلیت اس پہ کھل گئی تھی۔ وہ خرم، جو اس کے بینک میں معمولی کیشئر تھا۔ وہ خرم جو بظاہر بڑا نیک' بااخلاق' تہذیب یافتہ بنتا تھا۔ در حقیقت اندر سے اتنا غلیظ' گندا اور دوغلا تھا۔ نیلم کو یقین نہیں آرہا تھا۔ بالکل یقین نہیں آرہا تھا' ساری زندگی اپنی ماں کے الٹے سیدھے ہر فیصلے پہ سر جھکانے والی نیلم کو یقین آتا بھی کیسے؟ اس کی ماں اپنی نام نہاد انا' ضد اور بلاوجہ کی اکڑ کے پیچھے اس کی زندگی برباد کرنے تلی ہوئی تھی اور نیلم ایسی ناسمجھ تھی جو آنکھیں بند کرکے ان کی ہر بات مانتی چلی جارہی تھی۔ لیکن یہ بھی نیلم کا ایک انتقام تھا۔ شاید اپنی ماں سے یا خود سے۔ آخر وہ اتنی احمق' بدھو یا پاگل کیوں تھی؟ آخر کس عمر میں اسے عقل آنی تھی؟ جب تیمور اس کی زندگی میں آیا تب بھی وہ ناسمجھ تھی۔ جب وہ اس کی زندگی سے اچانک چلا گیا تھا وہ تب بھی ناسمجھ تھی۔ لیکن اب تو وہ سمجھ دار تھی۔ باشعور تھی۔ تیمور کی واپسی کے بعد تیمور میں در آنے والی تبدیلیوں' اس کے التفات اور اس کی معذرتوں پہ اتنا کیوں کر اکڑتی رہی؟ تیمور کی وضاحتوں کو پیر کی ٹھوکر سے اڑا دیا تھا۔ محض خرم کی وجہ سے؟ کیا واقعی ہی خرم کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ وہ محض تیمور سے بدلہ لے رہی تھی۔ ان دس سالوں کو جو اس نے تیمور کی یاد میں تڑپتے ہوئے گزارے تھے۔ جتنا تیمور نے اسے تڑپایا تھا۔ اتنا خود بھی تڑپتا۔ اتنا خود بھی جلتا۔ وہ اس کے دس سالوں کا پہلے حساب دیتا' لیکن وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ خرم کے گھر کیوں آئی تھی؟ اس صاف ستھری سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر وہ بڑی حیرت سے خود کو مخاطب کرتی سوال کر رہی تھی۔ پھر اسے یہ سوال اپنے اندر سے ہی مل گیا تھا۔

اسے آشیانہ ثقلین سے یہاں تک تقدیر کھینچ کر لائی تھی۔ تاکہ ایک ایسی ٹھوکر کا انجام دیکھ سکے۔ اگر یہ ٹھوکر اسے لگ جاتی تو کیا ہوتا؟! اگر وہ خرم کے گھر نہ آتی تو کیا ہوتا؟! اگر وہ کورٹ سے خلع لے لیتی تو کیا ہوتا؟! وہ اپنی اور اپنی بیٹیوں کی زندگی محض ماں کی انا' ضد اور اکڑ کے پیچھے نہیں ان کے غلط فیصلوں کے پیچھے تباہ کر لیتی۔ نیلم اس وقت صاف ستھرے روشن رستے کی طرف جارہی تھی۔ وہ رستہ جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ وہ رستہ جو تیمور کی طرف جاتا تھا۔ جدائیوں کے وہ سمندر جو تیمور پار کرکے اس تک آیا تھا۔ اب نیلم کو خود آگے بڑھ کے اس ہلکی سی خلیج کو ختم کرنا تھا اور وہ ختم کر سکتی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب اس کی امی اس کے گھر اور زندگی میں بے جا مداخلت نہیں کریں گی اور وہ تیمور کے ساتھ مل کر اپنی زندگی کے فیصلے کرے گی۔ ہر آلودگی اور ہر بدگمانی سے ہٹ کر جو امی نے بلا سبب اس کے دل اور دماغ میں تیمور کے خلاف بھر دی تھی۔ زندگی میں بس ایک ہی لمحہ ایسا ہوتا ہے' جو یا تو زندگی بنا دیتا ہے' یا زندگی تباہ کر دیتا ہے اور نیلم کی زندگی میں وہ ایک لمحہ بڑے خوش گوار انداز میں داخل ہوا تھا۔ جس کی آمد سے وہ ایک بڑی ٹھوکر سے بچ گئی تھی اور نیلم بدقسمت ہونے سے بچ گئی تھی۔ وہ پیچھے بکھری گندگی' غلاظت' بساند اور بو سے بھی بچ گئی تھی اور واپس اپنے گھر کی طرف رواں دواں نیلم بڑے خوش گوار انداز میں سوچ رہی تھی۔ زندگی میں کبھی کبھی ایک "بدبودار" لمحہ بھی قیمتی ہوتا ہے۔